

# مسوکافن

سید وقار عظیم

اعجاز پبلشنگ ہاؤس  
۲۰۴ - دریا گنج - نئی دہلی

# مِسْوَكَانْ

سَيِّد وَقَارَعَظِيمُ

عِجَازِ سِلْبِشِنْگُ هاؤس ۰۲۰۶ - دریاگنج - تی دہلی ۱۱۰۰۲

باراً أول

۱۹۸۲ء

تزاد

ایک خزار

مطبع

شیردانی آفٹ پرنس دہلی

پانچ روپے قیمت

ناشر

اعجاز پبلشگر ہاؤس

۳۰۶۰ - ناہرخان اسٹریٹ، دریا گنج، نئی دہلی

۱۱۰۰۲

# مسئلو کافن

سید وقار عظیم

منٹو کو اسکی حقیقت نگاری، اس کی لفظیاتی موشگانی، اس کی دُور بین و دور رس نگاہ، اس کی جرأت آمیز اور بے باکانہ حق گوئی، سیاست، معاشرت اور مذہب کے اجراء دار ول پر اس کی تلخ یکن مصلحانہ طنز اور اس کی مزے دار فقرہ بازوں کی وجہ سے سراہا گیا ہے۔ اور سیاسی، مذہبی، معاشرتی اور ان سب سے بڑھ کر جنسی زندگی پر اس نے مخصوص اور منفرد انداز سے نظر ڈالی ہے اس پر اسے مطعون کیا گیا ہے۔ اور اس دادِ تحسین اور تجوہ و تفحیک میں لوگوں کا جو روایہ رہا ہے اس میں حق پندی اور توازن بھی ہے۔ میکن اس سے کہیں زیادہ انداڑا و تفریط کا عذبہ غالب آتا ہے۔ تنقید و تبرہ کے اس سارے کھیل میں جو برسوں سے منٹو کی زندگی اور اس کے افساؤں کے محور پر کھیلا جا رہا ہے۔ منٹو ایک مثالی ہیرد بھی نظر آتا ہے اور مثالی ولن بھی۔ کچھ نظری اس بات کی عادی ہو گئی ہیں کہ اسے بس حُسن کا مجسمہ سمجھو کر دیجیں اور کچھ نگاہوں کو اس میں برائیوں کے سوا کچھ دکھائیں۔

## منٹو کا فن

ہیں دیتا۔ حالانکہ اگر عورت سے دیکھا جائے۔

تو ان دونوں طرح کے دیکھنے والوں کو جذباتی شدت پندی نے اصل حقیقت تک پہنچنے اور اس کے کھوئے کھرے کو پہچاننے کا موقع ہیں دیا۔

دنیا کی ہر چیز کی طرح منٹو نہ "محض" اچھا ہے اور نہ "محض" بُرا۔ اس کے انسانے نہ خالصتاً حسن و جمال کے مقابلہ ہیں اور نہ محض برائیوں کے حامل۔ اس کی حقیقت نگاری، اس کی نفسیاتی موشگانی، اس کی دوسری اور دوسری بنی نظر، اس کی جرأت آمیز حق گوئی، اس کی تلخ مصلحانہ طنز اور اس کی شگفتہ فترہ بازی کے اچھے اور بُرے دونوں پہلو ہیں۔ کبھی بہت بُرے۔

ان اچھے بُرے اور کبھی کبھی بہت اچھے اور بہت بُرے پہلوؤں کا سجز یہ کرنے کی کوشش کی جائے۔ وسیب سے چیلے انسان کی نظر ان بے شمار موضوعات پر پڑتی ہے۔ جن تک منٹو کی نظر پہنچی ہے۔ نکر، مزدور، طوالف، رند خرابات اور زلہ پاک باز، کشیر یا عمبی، دہلی، لاہور، فلم اسٹوڈیو، کالج، بازار، گھر، ہوٹل، چائے خانے، بکے، بوڑھے، جوان، عورتیں، مرد اور ان سب کی ذہنی الجھنیں اور ان ساری چیزوں سے بڑھ کر جنس اور اس کے گوناگون منظاہر منٹو کے موضوعات ہیں۔

ان موضوعات میں سے بعض عفنوں کو زیادہ عزیز ہیں۔ بعض کو جوں میں پہنچ کر اس پر جو سرشاری طاری ہوتی ہے۔ وہ دوسری جگہوں پر نظر نہیں آتی اور بعض افراد کا ذکر دہ جس ادائے خاص سے کرتا ہے۔

وہ ادا ہر موقع پر بتایاں ہیں ہوتی اور بعض بائیتیں ہکنے اور بعض رموز

آشکارا کرنے میں اسے جو مزاج آتا ہے۔ وہ دوسری بائیں کہتے اور کرتے وقت شاید حکوم نہیں ہوتا۔ لیکن ذکر کسی کوچے کا ہوا اور کسی بات کا ہوا۔ یہ کہیں نہیں معلوم ہوتا۔ کہ منٹو اس کوچے کے سارے پیچ و خم، اس شخص کے دل کے سارے بھیجا اور اس بات کی ساری نزکتوں اور رطافتوں سے واقع نہیں جھاں تک ان گوناگون موصوعات کا تعلق ہے۔

ان کے سلسلہ میں ایک اور چیز بھی سامنے آتی ہے۔ اور وہ یہ کہ بعض موصوعات کو اپنے افناں میں جگہ دے کر منٹو نے بہت سوں کی دل آزاری کی ہے۔ بہت سوں کی بڑائی مولی ہے۔ اور بہت سوں کی گالیاں سُنی ہیں، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ بہت سے پڑھنے والوں نے ان ہی گالیوں کو معیار بنانے کے لئے اس فنی مرتبہ کا اندازہ لگانے کی کوشش کی ہے اور یہ بات بہت کم کبھی گئی ہے اور اکثر دبی زبان سے کبھی گئی ہے کہ افسانہ نگار کی حیثیت سے منٹو کو پہچاننے کے لیے اس کے پیغمبر فن پر سب سے پہلے نظرِ الہی مزدoru ہے۔ اس لیے کہ منٹو کی افسانہ نگاری میں ان موصوعات کی بھی اہمیت ہے۔

جن کا منٹو نے پوری فنی ذمہ داری سے انتخاب کیا ہے۔ اور اس نقطہ نظر کی بھی اہمیت ہے۔ جوان موصوعات کے انتخاب کا ذمہ دار ہے۔ لیکن حقیقت میں جس چیز نے منٹو کو منٹو بنایا۔ جس چیز نے اسے وہ بڑائی دی۔ جس میں کوئی دوسرا افسانہ نگار اس کا ہمچھر نہیں۔ وہ اس کا فن ہے اور منٹو کی شخصیت اور اس کی افسانہ نگاری کے خواہ کسی پہلو پر کچھ لکھا جائے۔ اس کے فن کا ذکر ناگزیر ہے اور جب ہم یہ کہتے ہیں۔ فن کا ذکر ناگزیر ہے تو ہماری مراد یہ ہوتی

ہے کہ منٹو بنے جو بے شمار باتیں اپنے افنازوں کے ذریعے اپنے پڑھنے والوں تک پہنچائی ہیں۔ ان کے انہمار کا اسلوب کیا ہے۔ اور اس اسلوب کے اجزاء ترکیبی کیا ہیں۔

لیکن اس بات کا جائزہ لینے سے پہلے کہ منٹو کی افسانہ نگاری کافن کیا ہے اور منٹو کے اسلوب فن کی کیا حدیں ہیں۔ شاید اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ جب منٹو کے موضوعات اور اس کے نقطہ نظر سے الگ ہم اس کے فن کا ذکر کرتے ہیں تو ہمارے ذہن میں فن کا مفہوم کیا ہوتا ہے۔ اس ضمن میں سب سے پہلی چیز جو مستطی طور پر بحث کرنے والے کے سامنے آتی ہے۔ تکینک کے وہ میادیات اور مطالبہ ہیں جو ادب کی ایک صفت اور دوسری صفت میں مایہ الامتیاز سمجھے جاتے ہیں۔

داستان، ناول، ڈرامہ اور افسانہ بنیادی طور پر کہانی ہونے کے باوجود تکینک کے اصول و قواعد کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اچھا داستان گو، ناول نگار، ڈرامیٹ اور افسانہ نگار داستان، ناول، ڈرامہ یا افسانہ لکھنے وقت ان اصول و قواعد کی پابندی کو اپنا فرضی اولین جانتا ہے۔

ایک خاص صفت ادب کے ساتھ اس نے جو رشتہ قائم کیا ہے۔ اس کے خلوص اور صدقۃت کا لقایا ہے کہ وہ صفت ادب کے ان امتیازی اصول و قوائیں سے پوری طرح واقع ہو کر انہیں پوری طرح برتر ہے۔ ان اصول و قواعد کو جن کا دروس را نام اس صفت کی تکینک اس کی روایات یا اس کافن ہے۔ جاننا، سمجھنا اور ان کا صدقہ دل سے احترام کرنا اس رشتہ کا پہلا مطلب ہے۔

جس کی طرف میں نے ابھی اشارہ کیا۔ اس لئے کسی فنکار کے فن کا جائزہ  
لبنے کی پہلی منزل ہی یہ ریکھنا ہے۔ کہ اس فنکار نے فن کے ابتدائی مطالبات  
کو، ان اصول و قوانین کو اس کی روایات کو کس حد تک جانا، سمجھا، محترم جانا  
اوپنے فن میں برداشت کیا۔

فنی جائزہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ فنکار نے فن کی روایات کی پابندی  
کرنے کا حق ادا کر کے اپنے خیال اور احساس کو دوسروں تک پہنچانے کے کیا  
کیا دیسیلے استعمال کیے ہیں۔

ان مختلف وسائل کے استعمال میں فنکار کے شخیل، فکر اور ذہنی کا وش اور  
اہمگ و توجہ کو خاصاً داخل ہوتا ہے۔ اس لیے جو فنکار اپنے فن کو جس حد تک  
زیادہ عزیز رکھتا ہے اور جس حد تک اس سے اس فن سے اپنے رشتہ اور تعلق  
کا احساس زیادہ گہرا اور شدید ہوتا ہے۔ اسی حد تک اس کی توجہ، اہمگ اور  
ذہنی کا وشوں کی بدولت افہمار اور ابلاغ کے اچھے سے اچھے اور نئے سے نئے  
دیسیلے اس کے ہاتھ آتے ہیں۔

افہمار اور ابلاغ کی بھی منزل ہے جہاں مصنف کا شخیل اور فکر جو حقیقت  
میں اس کی شخصیت کے مختلف اجزاء اور عناصر ہیں۔

افہمار اور ابلاغ کے وسائل میں نئے نئے رنگ بھرتا ہے۔ بھی رنگ  
مصنف کے انداز اور اسلوب کی خصوصیت کا منظر ہے اور اسے اس فنی جائزہ  
کا ایک اہم جز سمجھا جاتا ہے جس میں فتنی روایات اور افہمار ابلاغ کے دوسرے  
وسائل شامل ہیں۔

## منڈو کا فن

فنی جائزوں کی بنا پر فنکار کے فتنے مرتبہ کا اندازہ  
لگاتے وقت چند اور باتیں بھی الیسی ہیں جو پیش نظر نہ رکھی جائیں تو یہ فنی جائزوں  
ادھورا رہتا ہے۔

ان میں سے ایک بات تو یہ ہے کہ فن کار اپنے انہماں، توجہ اور  
کاوش سے انہمار کے وسائل میں جو نئے نئے پہلو پیدا کرتا ہے۔ اور اپنی  
شخصیت کی قوت اور الفرادیت سے جو رنگ بھرتا ہے۔

ان پہلوؤں کا تیکھا پن اور اس رنگ کی شو خی ہمیشہ قائم نہیں رہتی۔ فن کار  
کے اعصاب ایک خاص منزل پر پہنچ کر اس کی شخصیت کے مختلف عناصر پر انتشار  
کا غلبہ ہوتا ہے تو فن کار نگ بھی چیکا ہونے لگتا ہے۔ یہ باتیں فنی جائزوں کی یعنی دالا  
نظر انداز نہیں کر سکتا۔

اس یہے کہ ان حقائق کو پیش نظر رکھے بغیر فنکار کے فن کے ارتقا کا ساری  
لگانا ممکن نہیں۔

اس سلسلہ کی دوسری اہم کڑی یہ بات ہے کہ گوشیخیت کے عناصر کے  
انتشار کے ساتھ ساتھ فن میں اخطاء پیدا ہونا لازمی ہے۔ لیکن فن کار کو فن  
کے ساتھ ایک خاص مدت تک تعلق رکھنے کی بنا پر انہمار کے وسائل پر ایک قدرت  
حاصل ہو جاتی ہے اور یہ قدرت اس کی شخصیت کے انتشار اور انہماں اور کاوش  
کی کمی کے باوجود داس کے اسکے اسلوب انہمار میں ان عناصر کو باقی اور قائم  
رکھتی ہے جو داس کے فن کی امتیازی خصوصیت سمجھے جاتے ہیں۔ یہ ضرور ہے  
کہ یہ عناصر جویشہ ظاہر ہونے کے سچائے صرف کبھی کبھی اُبھرتے اور انداز ہیرے

میں چک دکھا کر فائب ہو جاتے ہیں۔

منڈو کے افسانوی فن میں فن کے یہ سارے مدارج بدرجہ اُتم موجود ہیں اس کے فن نے یہ ساری منزلیں جس طرح طے کی ہیں۔ اُردو کے کسی اور افسانہ نگار کے یہاں ان کا سُراغ نہیں ملتا۔

افسانہ، ناول، ڈرامہ، داستان، کہانی ان سب میں بعض عناصر مشترک ہیں۔ کوئی نہ کوئی واقع اس قصتے سے تعلق رکھنے والے کردار، واقع کی ابتدا اور اس کے خاتمه تک اس کے مختلف مدارج، مصنف کا ایک مخصوص انداز فکر و نظر یہ سب کچھ اس کہانی میں بھی ہوتا ہے جو چوپال میں بیٹھنے والے بڑی سادگی سے ایک دوسرے کو سناتے ہیں۔ اس کہانی میں بھی جو بڑی بوڑھیاں رات کی خاموشی میں پھوپھو کو سناتی ہیں۔

اس افسانے، ناول اور ڈراما میں بھی جو فن کے پورے احساس کے ساتھ لکھا جاتا ہے لیکن ان کئی مشترک پہلوؤں سے قطع نظر کہانی کی ان مختلف اصناف میں سے ہر ایک کی ایک نہ ایک امتیازی خصوصیت بھی ہیں ہیں ہے۔ جو اسے دوسری صفت سے منفرد کرتی ہے۔

داستان میں سخیل اور لقotor کی زیگینی، ڈرامے میں کوئی نہ کوئی کشمکش ناول میں زندگی کی وسعت اور گہرا ہی اور افسانہ میں موصوع کی اکانی پر امتیازی اور الغزادی خصوصیات ہیں۔

افسانہ دوسری طرح کی کہانیوں سے اسی لحاظ سے منفرد اور ممتاز ہے کہ اس میں دامخ طور پر کسی ایک چیز کی ترجیحی اور مصوری ہونی ہے۔ ایک

## منٹو کافن

کردار، ایک واقع، ایک ذہنی کیفیت، ایک جذبہ، ایک مقصد، مختصر یہ کہ افسانے میں جو کچھ بھی ہو، ایک ہو، عام طور پر افسانہ نگار افسانہ کی اس بنیادی خصوصیت کی طرف سے غفلت بر ت کر افسانہ لکھتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ افسانے پڑھنے والے کے ذہن پر دہ گہرا تاثر قائم نہیں کر سکتے جو ہر اچھے افسانے کے ساتھ والستہ ہونا چاہیئے۔

اُردو کے افسانہ نگاروں میں پرمیم چند نے اکثر افسانہ کی امتیازی خصوصیت کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ لیکن کبھی کبھی جذبات کی رو میں بہہ کر ان سے بھی اس معلمہ میں آنکھ سے ہے کوتاہی ہوئی ہے۔ ایک فنکار کی حیثیت سے منٹو نے اپنی پوری فتنی زندگی میں کبھی اس حقیقت کو فراموش نہیں کیا۔ کہ انہیں اپنے افسانے میں کوئی ایک بات کہنی ہے اور اس طرح پڑھنے والے کے ذہن پر ایک خاص تاثر قائم کرنا ہے۔

ان کے چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے افسانے کا مطالعہ کرنے کے بعد پڑھنے والے کے سامنے بے شمار چیزیں آتی ہیں۔ یعنی منٹو کا ہر گیر مشاہدہ جسی ماہول پر اپنی نظر ڈالتا ہے۔

اس کے باریک سے باریک پیلو کو نظر میں رکھ کر اسے اپنے افسانہ کا پیشہ بناتا ہے واقعہ اور کردار کے ذکر میں منٹو بہت کم اس جرم کے مرتبہ ہوئے ہیں کہ وہ واقع اور کردار کی پوری تفصیلات پر عبور حاصل کئے بغیر اس کے متعلق کچھ بکھنے کی کوشش کریں۔

لیکن ایک مخفی صورت ماحول یا کردار کے سر پیلو اور اس کی سرفروائی اور

جزوی کیفیت سے پوری طرح واقف ہونے کے بعد بھی دہ اس ماحول با کردار کی مصوری کو اپنی افسانہ نگاری نہیں بناتے۔

یہ سارا علم عموماً ایک مخصوص تاثر پیدا کرنے کے لیے پس منظر یا وسیلہ کا کام دیتا ہے لیکن حقیقت میں! اس پس منظر کے پیچے کوئی ایک تاثر، عذب، ذہنی کیفیت موجود ہوتی ہے جسے سامنے یا ناظر کے ذہن تک پہنچانا افسانہ نگار کا مقصد ہے۔ مثلاً ان کے افسانے نیا قاون، خوشی، لغہ، اور نیا سال پڑھ کر پڑھنے والا افسانہ نگار کے مشاہدے، اس کے تخلیق، فکر اور تجزیہ، جیات کی بدولت بے شمار چیزوں کا عکس اپنی آنکھوں کے سامنے محسوس کرتا ہے۔

لیکن ان بے شمار چیزوں کا مشاہدہ مجموعی طور پر اس کے ذہن میں ایک خاص کردار کی ذہنی کیفیت کا نقش بھاتا ہے۔

افسانہ پڑھتے وقت ایک نئے ماحول اور ایک نئی فنا کی ان گفت لکھری اس کی نظر کے سامنے آتی اور رخصت ہوتی رہتی ہیں۔ اور ان سے حسب موقع پڑھنے والا لطف و حظ محسوس کرتا رہتا ہے۔ لیکن افسانہ ختم کر چکنے کے بعد افسانہ نگار کے معمور انہ فلم کے بنائے ہوئے یہ بے شمار نقش رخصت ہو جاتے ہیں اور خود رخصت ہوتے وقت صرف ایک چیز پڑھنے والے کے ذہن پر چھوڑ جاتے ہیں۔ یہ چیز نیا قاون، خوشی، لغہ، اور نیا سال، کے مرکزی کردار کی ایک مخصوص ذہنی کیفیت ہے۔ یہ سب افسانے اپنی واقعائی اور لغایتی زندگانی کے باوجود مجموعی چیزیت سے صرف اس گھرے تاثرا اور اس بندبائی

کیفیت کے ترجمان ہیں ۔

جس میں ایک خاص فرد مبتلا ہے۔ (مینٹر) اور دمیرا اور اس کا استقام، اپنی دلچسپ اور رومانی تفصیلات کی بناء پر شروع ہے آخر تک پڑھنے والے کو متاثر کرتے رہتے ہیں۔ ان افسانوں میں جو کردار پڑھنے والے کے سامنے آتے ہیں ان کی ایک ایک بات میں ان کے مخصوص مزانح اور اس مزانح کی منفرد خصوصیات کا عکس ہے لیکن افسانہ پڑھنے کے بعد پڑھنے والا جس چیز کا سب سے نیادہ عنایاں اثر مقبول کرتا ہے۔ وہ صرف ایک واقعہ ہے۔

ایک صورت میں واقعہ کی ہلکی سیکلی ہنسا دینے والی کیفیت اور دوسری صورت میں رومان اور مزانح کا ایک طالبلا تاثر پڑھنے والے کے ذہن پر ہر دوسری چیز کے مقابلہ میں اپنا نقش چھوڑ کر جاتا ہے۔

— اسی طرح "ستک" ایک مخصوص ماحول اور فضا اور اس ماحول اور فضا میں رہنے بننے والے گوناگوں کرداروں کی انفرادیت کا نقش ہونے کے باوجود مجموعی طور پر "ستک" کے سیہر وئن "سو گندی" کے کردار کی ایک مکمل تصویر ہے۔

وہ ساری فضائی افسانہ نگار نے مشاہدہ، تخلی اور فکر کی پوری قوتی سے کام لے کر تخلیق کی ہے اور وہ سارے کردار جن کی مدد سے اس فضائی کا خصوصی رنگ واضح ہوتا ہے مل جل کر "سو گندی" کے کردار کو مکمل کرنے میں حصہ لیتے ہیں اور اس طرح افسانہ میں بہت کچھ ہونے کے باوجود "سو گندی" ہی سب کچھ ہے۔ افسانہ ختم کرنے پر ہم "سو گندی" کے علاوہ باقی سب چیزوں کو، باقی کرداروں کو محبول جاتے ہیں۔

دہ گرد و پیش کی ہر چیز سر گاہ اب اگر اس طرح چھا جاتی ہے کہ ہمارے یہے  
سوائے اس کے اور کوئی چارہ بھی نہیں کہ صرف "سو گندی" کو یاد رکھیں اور اس طرح  
یاد رکھیں جسے ہم برسوں سے اسے جانتے اور پہچانتے ہیں۔ اس کی بہترین ٹہری  
بات اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے اور اس کے دل کا ہر راز ہمارا راز ہے۔

منٹو کی افسانہ نگاری فن کی مختلف منزوں سے گذری ہے۔ ان منزوں میں سے  
بعض منزوں ترقی کی ہیں اور بعض تنزل کی۔ لیکن ان میں سے برونز میں مشتمل  
اپنے اس منصب کو برابر یاد رکھا ہے کہ اسے کہانی کے ذریعے صرف ایک چیز یا ایک  
بات قاری کے ذہن تک پہنچانی اور اس کے دل میں آنارنی اور جاگزیں کرنی ہے  
افسانہ نگاری کے اسی بنیادی اصول نے یہ بات بھی سکھائی ہے کہ کہانی ختم ہونے کے  
بعد قاری کے ذہن پر ایک واحد تاثر قائم ہونا چاہئے۔

لیکن یہ واحد تاثر پیدا کرنے اور اسے قائم رکھنے کے لیے اسے مختلف  
فنی وسیلے استعمال کرنے پڑتے ہیں۔ یہ فنی وسیلے اگر پوری ذمہ داری اور پورے  
فنی احساس اور خلوص کے ساتھ کام میں نہ لائے جائیں تو محبوسی تاثر کا حصول  
بھی ناممکن ہو جاتا ہے اور کہانی کی اس وحدت میں بھی فرق پیدا ہو جاتا ہے  
جو اس کی بنیادی اور رامیازی خصوصیت ہے۔

افسانہ نگار یہ سوچ کر اور یہ فیصلہ کر لینے کے بعد کہ اسے اپنے افنا نے  
کے ذریعے قاری کے ذہن پر کون سا واحد لفظ قائم کرنا ہے۔ اپنے افنا نے  
کا ایک ڈھانچہ بناتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ افسانہ کس طرح شروع ہو گا، کس طرح  
آہستہ آہستہ آگے بڑھے گا اور کس طرح ختم ہو گا۔

اچھی کہانی کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ لکھنے والے نے کہانی کے مختلف حصوں میں آہستہ آہستہ ایسی فضایا بنا دی ہو کہ پڑھنے والے کا ذہن اس مجموعی تاثر کو بڑے فطری انداز میں قبول کرے۔

فضایا بنا نے اور ذہن کو ایک خاص تاثر قبول کرنے پر آمادہ کرنے کا شکل کام یوں تو پوری کہانی میں جاری رہتا ہے لیکن اس کا نقطہ آغاز افہان نے کے وہ ابتدائی الفاظ یا جملے ہیں۔ جنہیں تم افسانہ کی تہیید کہتے ہیں۔ افسانہ کی تہیید افسانوی فن کی ٹبری اہم، ٹبری دستوار اور افسانہ نگار کے نقطہ نظر سے ٹبرے کام کی منزل ہے۔

افسانہ نگار نے اپنے ہم سفر کی ابتداء اگر پوری طرح قدم جا کر ہماری اور استواری کے ساتھ کی ہے تو آگے کا سفر اس کے پیسے خود بخود آسان ہو جائے گا اور سب سے ٹبری بات یہ ہو گی کہ اسے اپنے سفر کے بالکل شروع ہی سے ایسے ہم سفر مل جائیں گے جو قدم سے قدم ملا کر اس کے ساتھ چلیں گے۔ یہ ہم سفر وہ قاری ہیں۔ جو افسانہ کی موزوں تہیید سے متاثر ہو کر افسانہ کے آنے والے حصوں کو درج پی اور اشیاق کے ساتھ ٹھہرھتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اچھے افسانہ نگار کسی اپنے افسانے کی تہیید کی طرف سے غفلت نہیں برستے۔ قاری کے ذہن پر پوری طرح چھا جانے کا جو نسب المیں افسانہ نگار کے سامنے ہے وہ مناسب اور موزوں تہیید کے ذریعہ آدھا بلکہ لعین اوقات = آدھے سے بھی زیادہ اس کے قبضے میں آ جاتا ہے۔

منوں نے ایک دیانت دار اور مخلص فن کار کی طرح ہمیشہ اپنی جیت اسی

یہ جانی ہے کہ وہ موزوں تہید ہے سرخی سے قاری کے ذہن پر چھا جائے۔

منڈو نے اچھے اور بُرے بتتے بھی افسانے لکھے ہیں۔ ان کے موضوع اور خیال سے پڑھنے والا خواہ متفق ہو یا نہ ہو۔ لیکن افسانے کی تہید میں اسے مزدرا یک دلکشی عجس ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو افسانہ پڑھنے پر بجورسا پاتا ہے۔

منڈو نے اپنے افسانوں کی تہید سے مختلف موضوع پر مختلف کام کیے ہیں۔ لیکن کام خواہ کچھ بھی لیا۔ قاری کے ذہن پر ابتداء سے ایک گہر انقدر بیٹھانے میں کامیابی مزدرا حاصل کی ہے۔

منڈو کے چند افسانوں کی تہید یہ دیکھو کر اندازہ لگا جائے کہ تہید کو پڑھنے والے کے لیے دل نشین بنانے کے علاوہ اس نے کن کن فنی مقاصد کے لیے استعمال کیا ہے۔

"نیا قانون" اس طرح شروع ہوتا ہے:-

"منگو کو چوان اپنے اڈے میں بہت عقلمند آدمی سمجھا جاتا تھا۔ گو اس کی تعلیٰ حیثیت صفر کے برابر تھی اور اس نے کبھی اسکول کا مسند بھی نہیں دیکھا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اسے دنیا بھر کی چیزوں کا علم تھا۔ اڈے کے وہ نام کو چوان جن کو یہ جاننے کی خواہش تھی کہ دنیا کے اندر کیا ہو رہا ہے اُستاد منگو کی دیکھ معلومات سے اپنی طرح واقع تھے۔"

اسی طرح "بلاؤز" کی تہییر یہ ہے:-

"پچھو دنوں سے مومن بہت بے قرار تھا۔ اس کا وجود کی پھوڑا سا بن گیا تھا۔ کام کرتے وقت، باقی کرتے ہوئے حتیٰ کہ سوچنے پر بھی اسے ایک عجیب قسم کا درد محسوس ہوتا تھا۔ الیا درد جس کو اگر وہ بیان بھی کرنا چاہتا تو نہ کر سکتا۔"

ان دونوں تہییروں کے ذریعہ قاری کا تعارف دوکرداروں سے ہوتا ہے لیکن ایک ایسے انداز میں ہوتا ہے کہ اس کے دل میں ان دونوں کے متعلق کچھ اور جانشی کی خواہش پیدا ہوتی ہے کہ اسے افسانہ کا باقی حصہ پڑھنے پر اکاتی اور مجبور کرتی ہے۔

دو تہییریں اور دیکھئے:-

"گھر میں بہت چہل پہل ہتھی۔ تمام گمرے رڑکے، رڑکیوں، بچتے چھیوں اور عورتوں سے بھرے تھے اور وہ شور برپا ہو رہا تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ اگر اس گمرے میں دو تین بچے اپنی ماڈل سے لیٹے دو دھپینے کے لیے بلبارہ ہے ہیں تو دوسرے میں چھوٹی چھوٹی رڑکیاں ڈھوکی لیے بلے سری تائیں اڑا رہی ہیں۔ نہ تال کی خبر ہے نہ لے کی، بس گائے جا رہی ہیں۔ یونچے ڈیوڑھی سے کر بالائی منزل تک مکان ہمماںوں سے کچھ کچھ بھرا تھا۔ کیوں نہ ہو، ایک مکان میں دو بیاہ رہے تھے۔ میرے دونوں بھائی اپنی چاندی دلہنیں بیاہ کر لائے تھے۔"

سنٹو کا من

”میری اور اس کی ملاقات آج سے ٹھیک دو برس پہلے الپ لو بندر پر ہوئی تھی۔ شام کا وقت تھا۔ سورج کی آخری کرنیں سمندر کی ان دور دراز لہر دل کے پیچے غائب ہو چکی تھی۔ جو ساحل کے پیش پر بیٹھ کر دیکھنے سے موٹے کپڑے کی لہریں معلوم ہوتیں تھیں میں گیٹ آف انڈیا کے اس طرف پہلا پیش چھوڑ کر جس پر ایک آدمی چمپی دالے تھے ہر اپنے سر کی ماش کرا رہا تھا، جہاں سمندر اور آسمان گھل مل رہے تھے، بڑی بڑی لہریں آہستہ آہستہ انہوں نے اور اسی معلوم ہوتا تھا کہ بہت گہرے رنگ کا قایلین ہے۔ جسے ادھر سے اُدھر سیٹا جا رہا ہے：“

پہلی تہیید ”شو غنو“ کی ہے اور دوسری ”بانجھ کی“ دو نوں تہیید دل میں افناز نگارنے آنے والے واقعات کے لیے ایک فنا تبار کی ہے اور اس فنا میں دو نوں موقعوں پر اتنے زیادہ رنگ بھرے ہیں کہ دیکھنے والا خود کو ان رنگوں کی کثرت میں ڈوبتا اور جذب ہوتا ہوا محکوس کرتا ہے اور پھر یہ سوچ کر کہ دیکھیں اس کے بعد کیا ہوتا ہے افناوں کو آگے بڑھاتا ہے۔ ”چاہا“ کی تہیید صرف ایک جملہ ہے لیکن اس جملے سے افناز نگارنے اپنا کام ایک دوسری طرح نکالا ہے:-

”گوپال کی ران پر جب یہ پھول انکلا تو اس کے اوسان خطا ہو گئے۔“

گوپال کے متعلق افناز نگارنے اچانک جو خبر سنائی ہے اس سے قاری کے

اوسان بھی مخواڑے بہت ضرور خطا ہو جاتے ہیں اور وہ گھبرا کر اپنے دل سے سوال کرتا ہے کہ اس کے بعد کیا ہوا ہو گا۔ یہی افسانہ نگار کی جیت ہے اس نے ایک معمولی سی خبر سننا کر قاری کو اپنے ساتھ یا اپنے پیچے پلانے پر مجبور کر دیا۔

ایک اور افسانے کی تہیید دیکھئے:-

”ایک پہاڑتہی تھرڈ کلاس ہوٹل میں دیسی دسکی کی بوتل ختم کرنے کے بعد طے ہوا کہ باہر گھوما جائے اور ایک ایسی عورت کی تلاش کی جائے جو ہوٹل اور دسکی کے پیدا کردہ تکرہ کو دور کر سکے؟“

یہ تہیید ”پہچان“ کی ہے اس میں نہ کسی کردار کا عارف ہے نہ کوئی فضایا ماحول بنانے یا پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے، نہ کوئی چونکا دینے والی خبر سنائی گئی ہے بلکہ بڑے واضح اشاروں میں یہ بتا دیا گیا ہے کہ آگے کی پچھ ہونے والا ہے اور اس طرح آنکھ کے اشارے سے قاری کو گویا یہ دعوت بھی دی گئی ہے کہ آؤ۔ اگر تم بھی ان شرابوں کی سرگردانی دیکھنا چاہتے ہو تو آجاؤ۔ اور معصوم قاری فوراً یہ دعوت قبول کر لیتا ہے۔  
اور سینئے:-

”اسے یوں محسوس ہوا کہ اس نگین حمارت کی سالوں منزدیں اس کے کاندھوں پر دھر دی گئی ہیں۔“

”یہ بغیر“ کی تہیید ہے اور اس میں افسانہ کے مرکزی کردار کی مشغولاں کی ذمہ کیفیت کا نقش قاری کے دل میں بٹھانے کی کوشش کی گئی ہے اور ہر قاری شاید یہی ہے

منٹو کا فن

گاکا بنا نگارا پی کوشش میں کامیاب ہوا ہے۔ اس لئے کہ منٹو وال کے اس شدید احساس کے پیچے کی قاتع سلام کر رہا ہے، اس کے دل میں یہ جانتے کی خلش پیدا ہو گئی ہے اور اس طرح یوں سمجھئے کہ افسانہ نگار کا تیر نشانہ پر بیٹھا۔

”دن بھر کی تسلی ماندی وہ بھی ابھی اپنے اپنے لبر پسٹی تھی اور لیٹتے ہی سو گئی تھی۔ میونپل کمیٹی کا داروغہ صفائی جسے وہ یڈھ کے نام سے پکارا کرتی تھی، ابھی اس کی ٹیکال پسیاں جن جمود کر شراب کے نشے میں چور گھروالیں گیا تھا وہ رات کو یہیں ٹھہر جانا مگر اسے اپنی دھرم منپی کا بہت خیال تھا جو اس سے بے حد پریم کرنی تھی۔“

یہ تہی ”ہنک“ کی ہے اور اس میں افسانہ نگار نے ایک کے سجاۓ کئی باتیں کہی ہیں۔ ایک تیر سے کئی شکار کئے ہیں، اس لئے کہ افسانہ میں آگے چل کر جو گھان شروع ہونے والا ہے اس کا تقاضا ہی یہ ہے کہ وہ بات سرے سادھے انداز میں کہنے کے سجاۓ ذرا تیکھے تیور کے ساتھ ہے۔ قاری افسانہ نگار کے ان تیکھے تیوروں کو پہچان جاتا ہے اور یہ سوچ کر کہ دیکھیں یہ تھک ہاڑ کر سو جانے والی اور اپنی بیوی کا محبوب داروغہ صفائی آگے جا کر کی گل کھلاتے ہیں، افسانہ کے منجد ہاریں کو دیڑتا ہے۔

منٹو نے افسانہ نگار کی حیثیت سے اپنے منصب کو پوری طرح پہچانا اور اپنے ترکش کے ہر تیر کی اہمیت کا صحیح اندازہ لگایا ہے۔ ان ہی تیروں میں سے ایک تیر اس کے افسانہ کی تہیید ہے جو افسانہ میں ایک نیا کام کرتی ہے، کردار کو متعارف کرنے کا، ایک

خاص فضایا ماحول بنانے کا، ایک پھر اکتی ہوئی خبر سنائے کا، کسی کردار کی ذہنی کشکش کی مستوری کرنے کا، آنے والے واقعات کے یہے زمین ہموار کرنے کا اور کبھی کبھی بہیک وقت کئی ملے جملے مقصد پورے کرنے کا، لیکن ان گوناگوں

کاموں کے علاوہ جو کام منٹو کے افناہ کی ہر تہید نے اپنے ذمہ لیا ہے یہ ہے کہ وہ قاری کے ذہن کو بیدار کر کے، اس کے دل میں گد گدی پیدا کر کے یا اس کے ذہن میں آگے پڑھنے کی خواہش پیدا کر کے افناہ پڑھ لینے پر آمادہ کر دے۔

منٹو کی فتنہ کا میابی کی یہ بڑی اہم منزل ہے اور یہ منزل نے کرنے کے یہے اس نے عموماً پورے سوچ بچار سے قدم اٹھایا ہے۔

تہید افناہ کا پہلا قدم ہے اور اس کا انجام اس کی آخری منزل۔ افناہ نگار اپنی تہید کے ذریعے پڑھنے والے کے ذہن اور دل پر لسلط جانا اور اسے افناہ کے آنے والے حصوں میں دلچسپی کی طرف حاصل کرتا ہے۔ آنے والے حصے سفر کی مختلف منزلیں ہیں۔ جن میں طرح طرح کی صورتیں مسافر کی راہ میں حاصل ہوتی ہیں۔ نہ جانے کیسے کانتے ہیں جو اس کے تلووں میں چیخنے کے یہے بلے قرار لظر آتے ہیں۔

افناہ پڑھنے والائی صورتوں کو آسان بنانے اور راستے میں چیلے اور بھرے بھوئے کاٹوں کو راستے سے ہٹانے کے یہے افناہ نگار کی رائہنگی اور مدد کا طالب ہوتا ہے۔

بالآخر افناہ نگار کی رائہنگی اسے منزل مقصود تک پہنچاتی ہے، جسے ہم افناہ کا انجام بھتے ہیں۔ راہ کی ساری کٹشن منزلیں طے کرنے اور چیخنے والے کاٹوں کی خلش کو گوارا اور

آسان بنایتے کے بعد اس کی سب سے بڑی خواہش اور تھنا یہ ہوتی ہے کہ اس کی منزل اس کے قلب و ذہن کے لیے سکون و راحت کا سرایہ بہم پہنچا سکے۔ پڑھنے والے کے ذہن کو یہ سکون اور اس کے دل کو یہ راحت دینے کے لیے افسانہ نگار کو ایک ایسے انجام کی جستجو کرنی پڑتی ہے جو فنی حیثیت سے ملے کی ہوئی منزلوں کا منطقی نتیجہ بھی معلوم ہو اور پڑھنے والے کے لیے قابل قبول بھی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ افسانہ نگار کو اپنے انجام کی تلاش میں پوری ذہنی کاوش کی مزورت محسوس ہوتی ہے۔

افسانہ کے خاتمه پر افسانہ نگار کی دراسی سُستی، دراسی تن آسانی، دراسی ہسل انگاری اور بالکل معمولی سی غفلت اور تحملن اس کے افسانہ کا خون بھی کر سکتی ہے اور پڑھنے والے کے لیے کوفت اور خلش کا باعث بھی بن سکتی ہو۔

منٹو نے اپنے انسانوی فن میں انجام کی ان نزاکتوں کو پوری طرح محکوس کر کے عموماً اپنافنی منصب پورا کرنے کی طرف توجہ دی ہے۔ اس نے اس "انجام" سے قاری کے ذہن کو متاثر کرنے کی خدمت بھی انجام دی ہے اور افسانہ کو افسانہ کی حیثیت سے مکمل کرنے کا کام بھی لیا ہے۔ منٹو کے بعض افانوں کے انجام دیکھ کر اس کے فن کی خصوصیت کا اندازہ لگائیے۔

ان کا افسانہ "نیاقالون" اس طرح ختم ہوتا ہے:-

"اُستاد منگو کو پولیس کے سپاہی تھانے لے گئے۔ راستے میں اور تھانے کے اندر وہ 'نیاقالون' نیاقالون چلاتا رہا مگر کسی نے ایک

نہ سُنی۔

”نیا قانون“ نیا قانون کیا بکر رہے ہے ہو۔ قانون وہی ہے پڑانا؛ اور اس کو حوالات میں بند کر دیا گی۔

”چاہا“ کا انجام یہ ہے:-

”نرالا بڑے انہاک سے چھاہا تراش رہی تھی۔ اس کی پلی پلی انگلیاں چینچی سے بڑا نفیس کام لے رہی تھیں۔ چھاہا کاٹنے کے بعد اس نے تھوڑا سا مرہم نکال کر اس پر چھیلایا، اور گردن جھکا کر اپنے کرٹے کے بننے کھولے۔ سینے کے دامنی طرف چھوٹا سا انجار ستفا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ننکی پر صابن کا چھوٹا سا نامکمل بلبلہ الگا ہوا ہے۔

نرالاتے چھاہے پر عجونک ماری اور اس سے انجار پر جاویا۔

”شرنشیں“ کے آخری الفاظ یہ ہیں:-

”وہ دیر تک سوچتی رہی۔ وہ اب زیادہ سمجھدہ ہو گئی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے بڑے دیصے بچے میں کہا۔ ”مجھے زندہ رہنا ہو گا۔“

اس کے اس دیصے بچے میں عزم کے آثار تھے۔ اس تھکی ہوئی جوانی کو اونگھتی ہوئی چاندنی میں چھوڑ کر میں اپنے فلٹ پر چلا آیا اور سو گیا۔

## مشوکا فن

”ہٹک کی بیرون ”سو گندی“ ہم سے اس طرح رخصت ہوئی ہے:-

بہت دیر تک وہ بید کی گرسی پر بیٹھی رہی - سوچ بچار کے بعد بھی جب اس کو اپنا دل پر چانے کا کوئی طریقہ نہ ملا تو اس نے اپنے خارش زدہ کرنے کو گود میں اٹھایا اور سا گوان کے چوڑے پنگ پر اسے پہلو میں لٹکر سو گئی -

”..... اس کے حلق سے ایک نفرہ ..... کان کے پردے پھاڑ  
دینے والا نفرہ، پچھلے ہوئے گرم گرم لا دے کے مانند لگا — ہست  
تیری .....!

جتنے کبوتر ہوٹل کی منڈیوں پر آؤنگہ رہے تھے ڈر گئے اور پھر پھردا نے لگئے۔ نفرہ مار کر جب اس نے اپنے قدم زمین سے بڑی مشکل کے ساتھ علیحدہ یکے اور دوپس مڑا تو اسے اس بات کا پورا یقین تھا کہ ہوٹل کی حمارت اڑا اڑا دھم سے پنجے گر گئی ہے اور یہ لغزہ سن کر ایک شخص نے اپنی بیوی سے جو یہ شور سُن کر ڈر گئی تھی، کہا - ”پگلا ہے“

(نفرہ)

”..... پہلے پہل تو میں بہت متjur ہوا کہ یہ کس کی حرکت ہے مگر فروٹی ہی

## سنٹو کا فن

سب معاملہ صاف ہو گیا۔ سیوا جی میری عین حاضری میں اپنی ہماری سلطنت پر نہایت کامیابی سے چھاپہ مار گئے تھے۔

(میرا اور اس کا انتقام)

---

«اس واقع کو ایک زمانہ گزر چکا ہے مگر جب کبھی میں اس کو یاد کرتا ہوں، میرے ہوتوں میں سویاں سی چھٹنے لگتی ہیں۔ یہ نامکمل بوسہ سہمیتہ میرے ہوتوں پر اٹکا رہے گا۔»

(نامکمل تحریر)

”جب اس کو غسل دینے لگے تو ہسپتال کے ایک نوکرنے مجھے بلا یا اور کہا ”ڈاکٹر صاحب! اس کی مشنی میں کچھ ہے؟“ میں نے اس کی بند مشنی کو کھول کر دیکھا۔ لوہے کے دو کلپ نہے۔ اس کی بیگوں کی یادگار! ان کو نکالن نہیں۔ یہ اس کے ساتھ ہی دفن ہوں گے۔“ میں نے غسل دینے والوں سے کہا اور دل میں غم کی ایک عجیب و غریب کیفیت لئے دفتر چلا گیا۔

(بیگو)

---

منٹو کا فن

”وہ گھر اکرا مھا اور سامنے کی دیوار کے ساتھ اس نے اپنا ماتھا رگڑنا شروع کر دیا جیسے وہ اس سجدے کا لشان مٹانا چاہتا ہے۔ اس عمل سے اسے جب جسمانی تکلیف پہنچی تو پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔ سر جھکا کر اور کاندھے ڈھیلے کر کے اس نے عسلی ہونی آواز میں کہا ”اے خدا ! میرا سجدہ مجھے دالپس دے دے .....“

(سجدہ)

منٹو کی مختلف کہانیوں کے یہ سب فاتحے جہاں ایک طرف اس مشترک خصوصیت کے حامل ہیں کہ ان سے پڑھنے والے کو اپنے ذہنی انتشار کے محنت کرنے میں مدد ملتی ہے اور وہ کہانی کے انجام میں سے اس اشتیاق کی تلکین تلاش کر دیتا ہے جو کہانی کی رفتار کے ساتھ ساتھ اس میں پیدا ہوتا اور پڑھتا رہتا۔

دوسری طرف وہ ان میں سے ہر ایک خاتمہ کو اس منطبق ربط کی آخری کڑی بن کر جو کہانی کی تہیید سے شروع ہو کر برابر زیادہ منظم بتا رہا تھا۔ افناہ کی فنی زنجیر کو مکمل کر دیتا ہے۔ ان میں سے ہر خاتمہ کی ایک لفیقی اور جذباتی حیثیت ہے اور دوسری فنی۔ منٹو نے جذبات، لغیات اور فن کے رشتے جوڑنے اور انہیں صعبو ط بنانے میں جمعیتہ اپنی کہانیوں کے انجام سے کوئی نہ کوئی کام لیتے۔

## منٹو کا فن

”نیاقاون“ کے خاتمہ میں اُستاد منگو خاں کی اس جذباتی شدت کا ایسا متناد رہ چکا ہے جس سے پڑھنے والے کے دل میں درد کی ایک ٹیکی اٹھتی ہے۔ ”چاہا“ کا اسجام واقعہ نگاری اور لفیاقتی تحریز کا بڑا سیدھا سادا اور ایک ایسا غیر متوقع انتزاع ہے جو ایک معمولی سے واقعہ کو اس کی نظر میں بڑی اہمیت دے دیتا ہے۔

”خوشین پر“ کا اسجام جذباتی کھینچا، کشمکش اور اس کے بڑے سادہ لیکن فن کا رانہ حل کی تصویر ہے۔ ”ہنک“ کے اسجام میں افسانے کے دیئے پیش منظر، ایک خاص کردار کے شدید رہ عمل اور زندگی کے ایک بڑے دُکھتے ہوئے ناسور کو بظاہر ایک معمولی سے واقعہ کے ذکر سے اس طرح حل کیا گیا ہے کہ تاثر کی شدت کم ہونے کے بجائے ایک مستقل صورت اختیار کر لیتی ہے اور پڑھنے والا سو گندی کی جذباتی شدت میں اس کا ہم نواہو کراس چیز سے نفرت کرنے لگتا ہے جو سو گندی کے نزدیک قابل نفرن ہے۔ ”نعروہ“ کے آخری چند جملوں میں کہانی کے مرکزی کردار کیشووال کی جذباتی شدت اور اعصابی کشمکش کو تھوڑے سے لفظوں میں بیان کر کے افسانہ کو جس جملے پر ختم کیا ہے اس کی ساری فنا کی شدت کو اور بھی خمایاں کر کے زندگی کی ٹریجڈی کو تلخ تربنا دیتی ہے۔ جذباتی شدت اور فنا کی تلخی کو اس طرح کی سادگی سے خمایاں کرنا منٹو کے افاؤں کے خاتموں کی ایک واضح خصوصیت ہے۔

”بیگو“ کا اسجام منٹو کے فن کی ایک اور خصوصیت کی ہلف اشارہ کرتا ہے اور وہ یہ کہ منٹو اپنے افسانے کے خاتمہ پر ایک بظاہر بالکل غیر ایم اور معمولی بات کہہ کر پڑھنے والے

کے ذہن کو ایک بار پھر ٹبری تیزی سے ان سارے واقعات میں گزار دیتے ہیں۔ جو انسان نے میں اس سے پہلے بیان ہو چکے ہیں۔ اس مرتبہ یہ معمولی سی غیر ایم بات گذرے ہوئے واقعات میں ایک ایسا رنگ بھروسی ہے جو اس سے پہلے پڑھنے والے کی نظر سے ادھل رہتا۔

”میرا در اس کا استقام“ میں آخری جملے میں پھر ہوئی ہلکی سی ایما پست کہانی کے دلوں مرکزی کردار دل کی ذہنی اور عصباتی کیفیت کو آئینہ کی طرح روشن کر دیتی ہے۔ دلوں کردار دل نے کہانی میں شروع سے آخر تک جو کچھ کیا اور کہا ہے اس سے مختلف پڑھنے والے جو مختلف تابع اخذ کرتے ہیں اس سیدھے سادھے جملے سے ان میں ممکنہ ممکنہ اور ممکنہ آہنگ پیدا ہو جاتی ہے اور ہر پڑھنے والا صرف ایک واضح اور صریح نتیجے کے سوا کسی دوسرے نتیجے پر نہیں پہنچتا۔

”نا ممکن تحریر“ میں آخری جملے میں بات کہنے کے ایک نئے انداز سے ایک معمول سے روکھانی واقع کو ایک ناقابل فراموش یاد کی حیثیت مل جاتی ہے۔

”مسجدہ“ کا انجام منٹو کی اس منفرد خصوصیت کی ترجیانی کرتا ہے جس میں افناز لگار کوئی ایسی بات کہہ کر جس سے پڑھنے والوں میں سے بعض کے تصورات پر ایک چوتھی سی لگتی ہے اپنے فن کے لیے زندگی کا سامان مہیا کرتا ہے۔

منٹو کی مختلف کہانیوں کے ان خاتمتوں پر نظر ڈال کر ان افنازوں کا فن تحریر یہ کرنے والا واضح طور پر یہ بات محسوس کرتا ہے کہ فن کے نقطہ نظر سے سب خاتمے افنازے کے مجموعی

## منڈو کا فن

عل کرنے کی خدمت انجام دینے کے علاوہ پڑھنے والے کے ذہن کے بیان کے لئے اس مرتب شے بنتے ہیں جو سر احمدی فنِ تخلیق کے ساتھ والبته ہوتا ہے۔

الن سب خاتمتوں میں لکھنے والے کی قدرت بیان اور اس کے انداز فکر کی نظرت اور شوخی ہر جگہ ایک نیارنگ پیدا کرتی ہے۔ کبھی محض سادگی بیان سے کبھی تنا دا سے کبھی تکرار سے، کبھی مزاج کی شوخی سے، کبھی طنز سے اور کبھی مشاہدہ، فکر اور تخلیل کے امتزاج سے وہ اپنے فن کی تکمیل میں مدد لیتا ہے اور پڑھنے والا اگر غور سے دیکھے تو یہ محسوس کرنے میں دقت نہیں ہوتی کہ افسانہ کے خاتمه کا یہ انداز پوری طرح سوچا سمجھا ہوا ہے۔ افسانہ نگار کے خاتمه کے وہ چند جملے جن میں ہر جگہ اس کی ذہانت، فطانت، اور شوخی نمایاں ہے محضاتفاق کا نتیجہ نہیں۔

افسانہ اُتار چڑھاؤ کے مختلف مرحلے طے کر کے یہاں تک پہنچا ہے۔ بلکہ شاید یوں کہنا زیادہ صحیح ہے کہ افسانہ نگار نے اسے اس منزل تک پہنچایا ہے اور اس طرح پہنچایا ہے کہ تعلکن کا شاہ بہ کبھی پیدا نہیں ہونے پایا۔

افسانہ کے انجام میں وہی تمازگی دتوانائی یہاں بھی ہے جو اس کے آغاز میں تھی اور یہ نتیجہ ہے۔ افسانہ نگار کی اس فتنی توانائی کا جو سر مرحد پر اور سر منزل میں اس کی جم عناء اور حکم سفر ہے۔

افسانہ کا آغاز اور اس کا انتہم۔ ان دلوں مرحلوں کے درمیان افسانہ نگار کو جن مرحلوں سے گذرنا پڑتا ہے وہ اگر ان میں سے کسی ایک کی اہمیت کی طرف سے بھی

عذالت یا بے نیاز تی برستے تو انسان کے مجموعی تاثر میں ذرق پھیل سو جانا ضروری ہے۔ منٹو کون کے ان مراحل کا پورا احساس ہے اس لئے ان کا ہر انسان آغاز سے انجام تک بعض واضح مرتبے طے کرتا ہے اور اس طرح برا انجام میں ایک ایسی منطق ہوتی ہے۔ جس کا پڑھنے والے کو احساس تو نہیں ہوتا لیکن اس سے وہ متاثرا اور مسرور ضرور ہوتا ہے۔

انسان شروع ہو کر دیسمی لیکن پتی تلی چال سے۔ پتے نرم لیکن پڑتے تو ان اقدام رکھنا ہوا آگے پڑھتا ہے اور جوں جوں آگے پڑھتا ہے۔ پڑھنے والے کے دل و دماغ پر اس کا قبضہ زیادہ مسحکم اور زیادہ تعینی ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس دیسمی اور جپی تلی رفتار سے انسانہ اپنے انجام کو پہنچتا ہے اور انسانہ کے سر مرحد پر اس کا ساتھ دینے والا فاری سفر کے اختتام پر ایک طرح کہ کون، ایک طرح کی سرت محوس کرتا ہے۔ اسے یوں لگتا ہے اس نے کون بہت پڑا مرحلہ طے کیا ہے اور پڑی کامیابی سے طے کیا ہے۔

یہ احساس ہی حقیقت میں افسانہ نگار کی فنی کامیابی کی دلیل ہے۔ ایک ایسی کامیابی جو یوں ہی اتفاقاً ہاتھ نہیں آ جاتی۔ اس میں لکھنے والے کو پورے سوچ بچار سے کام لینا پڑتا ہے۔ آغاز اور انجام کے درمیان کی ہر حلقہ پڑی کڑی کو پڑی احتیاط سے اس جگہ جوڑنا پڑتا ہے جو اس کے لیے زیادہ موز دیں ہو۔ کوئی کڑی ذرا بھی جگہ سے بے جگہ موجود تھا اس کے سرے اور آخری سرے میں جو عمود ربط ہے اس میں جیسے پڑ جائیں اور پڑھنے والے کو اس ربط میں ایک خوشگوار حبکار کا جو تصور پوشیدہ ہے وہ ریزہ ریزہ ہو جائے۔

ہمارے کم انسانہ لگاروں نے کڑیوں کے ربط کی اس جنکار کے احساس کو اہمیت دی ہے اور جنہوں نے دی ہے انہوں نے ہمیشہ اس کے فنی مطابات کا پابند رہنا ضروری نہیں سمجھا۔

منٹو کے فن کا یہ اور امتیاز ہے کہ اس نے آغاز اور انجام کو ایک زنجیر میں منسلک کرنے کی اہمیت کبھی نہ مبتلا تے ہوئے ہمیشہ۔ انسانے کی ضرورت کے مطابق اس کے دریانی حصوں کی ساخت، ترتیب، رفتار اور اُمار چڑھاؤ کو پوری فنی ذرداری کے ساتھ درستہ رہتا ہے۔

منٹو کے نزدیک فن کے ان مراحل کی جو اہمیت ہے اس کا اندازہ منٹو کے بعض افسانوں پر نظر ڈال کر کیجئے۔

”نیا قاون“ کے اُستاد منگو خاں کے جذبات کی پہلی منزل تودہ ہے جب وہ بندستان میں نافذ ہونے والے جدید آئین کی خبر سن کر خوشی سے پھولانا ہیں سماں اور اس کا انجام یہ ہے کہ نیا قاون نافذ ہو جانے کے بعد بھی اسے ایک گورے ترٹنے کے جرم میںحوالات میں بند کر دیا جاتا ہے۔

اس آغاز اور انجام کے دریانی حصوں کو اس طرح پڑ کر ناک افسانے کا انجام پڑھنے والے کے لیے ہر درجہ کرب انجیز بن جائے۔ منٹو کے فنی احساس کی پڑیاں جوئی ترتیب و تنظیم کا منہر ہے۔

ہی صورت "کالی شوار" کے ساتھ ہے۔ کالی شوار میں طوالف کی زندگی اور اس کے گناہ نے ماہول سے تعلق رکھنے والی بہت سی چیزیں پڑھنے والے کے سامنے آتی ہیں۔ اسی ماہول میں واقعات میں ایسا اُتا رپڑھاڑ پیدا ہوتا ہے اور دوہا ایسے یونچ دریچ مرحل سے گذرتے ہیں کہ پڑھنے والا ماہول کے گناہ نے پن کی طرف متوجہ ہوئے۔ بغیر صرف ان لفیاں حملہات میں دلپی لیتا ہے جو کرداروں کو ایک خاص طرح کے عمل کی طرف مائل کرتے ہیں۔

"کالی شوار" طوالوں کی گندی کہانی ہونے کے باوجود پڑھنے والے کا سائنس تاثر کرتی ہے کاس میں اس ماہول کے دو کرداروں کی ذہنی کیفیتوں کا ایسا بجز یہ ہے جس میں کہانی کی ساری دلکشی ہے۔

اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ افسانہ نگار نے شروع سے آخوندک افسانے میں جتنی چھوٹی بڑی باؤں کو ایک زنجیر میں مربوط کیا ہے ان میں ایک ایسا مشتبہ پیدا ہو گی ہے جو کسی سخت سے سخت عادث سے بھی بہیں ٹوٹ سکتا۔

کہانی کے مختلف مکاروں میں یہ کبھی نہ ٹوٹنے والا رشتہ قائم کرنا، اس کے آغاز اور اسجام کو اس طرح چھوٹی بڑی بہت سی اہم اور غیر اہم باؤں کے ذریعہ اپس میں جوڑنا کر دلوں اپس میں لازم و ملزم معلوم ہونے لگیں۔ اور دلوں منطقی طور پر یوں شرود شکر ہو جائیں کہ ایک دسرے کا سبب اور نتیجہ بن جائیں۔

منٹو کے من کی ایسی خصوصیت ہے جو ان کے افسانے میں (یا کہ اکثر افسانوں میں)

موجود نظر آئے گی۔ منٹو نے اپنی اسی خصوصیت کے ذریعے بہت سے پڑھنے والوں کو اپنا گروہ بنا یا ہے۔

---

(۲)

منٹو کے افنازوی فن کا ایک سپلاؤ دہ ہے جس کا ذکر میں اب تک کرتا رہا ہوں اور جس میں افسانہ کی مصنوعی ساخت، ترتیب، تشکیل اور تعمیر جیسی چیزیں شامل ہیں۔ افسانہ کی تعمید، اس کی اٹھان، اس کے واقعات کا اندازہ چڑھاؤ، پیچ اور الجھاؤ کے بعد افسانہ کا نقطہ عروج اور اس کا خاتمه ان سب چیزوں کا تعلق افسانے کے ڈھانپے اور اس کی ساخت سے ہے اور اس ساخت میں افسانہ کی ظاہری ہیئت اور اس ہیئت کا مجموعی تاثر پڑھنے والے کے لیے دو سب سے اہم چیزیں ہیں۔

منٹو نے افنازوی فن کے اس ظاہری اور خارجی سپلاؤ کو اور اس کے مختلف اجزاء اور عنابر کو جواہیت دی ہے اس سے ہمیں یہ اندازہ لگانے اور یہ نتیجہ اخذ کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی کہ منٹو ایک فن کا رکھیت سے فن کے ان ظاہری سپلاؤں کو اپنے افسانے کی ساخت اور تشکیل میں ایک بنیادی اور اہم حیثیت دیتے ہیں اور ان کی ہیئت ان کے نزدیک اس لئے ہے کہ یہ پڑھنے والے کے ذہن اور قلب پر ایک معنوں تاثر قائم کرنے کے لئے دستیں

میں گویا فن کا رکا مقصود بالذات فن کے یہ ظاہری پہلو بہرگز نہیں وہ تو ان ظاہری پہلوؤں سے ایک اہم وسیلہ کا کام لے کر تاثر پیدا کرنے کا دہ معقد حاصل کرنا چاہتا ہے جو ہر اپتھے فن کی مشترک خصوصیت ہے۔

اس لئے منٹو کے فن کا تجزیہ کرنے کی یادداں منزل ملے کر لینے کے بعد ہمیں یہ سوچنا پڑتا ہے کہ منٹو نے اپنے افناوں میں تاثر انگریزی کی خصوصیت کو فن کی بنیاد بنائی کہ حصول کے لیے ان خارجی اور تلکنیکی چیزوں کے علاوہ اور ایسے کون کون سے طریقے برترے اور استعمال کئے ہیں جنہیں ہم اس کے اسلوب نگارش کی خصوصیت کہہ سکیں۔

یہ صحیح ہے کہ کسی افسانے کے مجموعی تاثر کو ایک خاص رنگ دینے میں فن کے ان ظاہری پہلوؤں کا بھی ایک خاص مقام ہے جن کا ذکر اب تک ہوتا رہا ہے۔ لیکن ان سے بھی خاص حشیثت انہی ادراہ بیان کے ان طریقوں کو حاصل ہے۔

جہیں ہر مصنف اپنی اپنی لپند، اپنی اپنی صلاحیت اور مذاق کے مطابق برتاؤ رہا ہے۔ ایک سیدھی سادھی یا پیچیدہ سے پیچیدہ بات ہے کہ انداز کیا ہو، اس کے لیے کسی خاص محل پر سیدھے سادھے فقرے، اشارے، گنے ہے، تشبیہ، استعارے، تقادیر یا تکرار میں سے کون سا حرہہ زیارہ مؤثر ثابت ہو گا یہ بات ہر مصنف اپنی اپنی صلاحیتوں کے مطابق سوچتا اور ان صلاحیتوں کے مطابق ان میں سے جس حرہہ یا وسیلہ کو جس خاص محل کے لیے موزوں اور مؤثر سمجھتا ہے استعمال کرتا ہے۔

لغنوں، فقروں، اشاروں، گنے ہوں، تشبیہوں اور استعاروں کے استعمال کا یہی محفوم

اور صفر دانداز ایک مصنف اور دوسرے مصنف کے اسلوب میں فرق پیدا کرتا ہے۔ منٹو کے انسانوی فن کو اگر اسلوب اور اپنے اس کے ان وسائل کے لفظ نظر سے پر کھنے اور جانچنے کی کوشش کی جائے تو سب سے پہلی چیز جو پڑھنے والے کو شدت کے ساتھ تاثر کرتی ہے یہ ہے کہ منٹو کے پاس معمولی سے معمولی بات کے اپنے اس کے لیے ایک غیر معمولی انداز موجود ہے۔

فقرہ کی ساخت میں معمولی سی تبدیلی لفظوں کے بہترنے میں تحریکی سی جدت پسندی اور بہت اہم اہم بڑی گھری بات کو اس طرح ادا کر دیتے کہ جیسے وہ بات نہ اہم ہوئے یعنی منٹو کے اندازِ اظہار کے بعض واضح پہلو ہیں۔

بعض مکڑے دیکھ کر ان کے اسلوب کی ان خصوصیتوں کو پر کھنے اور جانچنے کی کوشش کیجئے۔

۱ - سب سے پہلی مثال "نیاقانون" کی ہے۔ اتنا منگو نئے قانون کی خبریں کر آیا ہے اور یہ جر کسی دوسرے ٹکر پہنچانے کے لئے بے قرار ہے اتنے میں نتھر گنجائی پر آتا ہے۔ منگو بلند آواز میں اس سے کہتا ہے ب-

"ماہہ لا ادھر۔ الیسی جرسناؤں کہ جی خوش ہو جائے۔ تیری اس گنجی کھوپری

پر بال اگ آئیں"

۲ - "پہنچان" میں بازار حن کی عورتوں کے متعلق کہا گیا ہے — "یہ نگ بدنگی عورتیں مکاون میں پکے ہوئے چھوٹوں کے مانند لٹکتی رہتی ہیں۔ آپ

پیچے سے ڈیلے اور پھر مار کر انہیں گرا سکتے ہیں ॥

۲ - "پہچان" ہی میں ایک رُذکی کا ذکر یوں آیا ہے "مرد ڈیاں اسی کے ہاتھوں سے پکے فرش پر گپڑی تھیں اور مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انمازع رد رہا ہے اور یہ مرد ڈیاں اس کے آنسو ہیں ॥

۳ - "پہچان" میں ایک اور بانداری عورت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں - "دہ اس انداز سے اپنا ہاتھ ہلا رہی تھی جیسے مکار دو کاندار کی طرح ڈنڈی مارے گی اور کبھی پورا نول نہیں تو سے گی ॥"

۴ - "شوشو" میں ایک جگہ کہا گیا ہے - "شو شو - شو شو - اسے یہ کیا؟ دو تین بار اس کا نام میری زبان پر آیا تو میں نے یوں محسوس کیا کہ پھر پنٹ کی گویاں چوس رہا ہوں ॥"

۵ - "شوشو" ہی میں سونے سے پہنچی کیفیت یوں بیان ہوئی ہے - "میری پلکیں آپس میں ملنے لگیں۔ ایسا محسوس ہونے لگا کہ میں دھنکی ہوں۔ دل کے بہت بڑے انباد میں دھنما جا رہا ہوں ॥"

۶ - "خوشیا" میں - "کاشا کا نسکا جسم موہ کے ٹپے کے ماند اس کی آنکھوں کے سامنے کھڑا تھا اور پگھل پگھل کر اس کے اندر جا رہا تھا -

۷ - آپ کرایے آدمی نظر آئیں گے جو محنت کرنے کے ساتھ میں با بخچہ ہیں (با بخچہ)

۸ - "— محنت کا استغاثہ بھی ہو سکتا ہے ॥ (با بخچہ)

۱۰۔ "اندر ہی اندر اس نے اپنے ہر ذرے کو بہبایا تھا کہ وقت پر کام آئے۔ (نعرہ)

۱۱۔ "جب شیکل نے یہ نے کہ ہر اخراج کی تو مومن کو ایسا خسوس ہوا کہ اس کے اندر رہنے کے سی غباء سے بچتے گئے ہیں۔" (بلانڈز)

۱۲۔ "نتھو کے دن پر ایک گھونسہ سالگا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ دوپہر کی دھوپ میں اڑنے والی ساری چیلیں اس کے دماغ میں گھس کر چینخنے لگی ہیں (اس کا پتی)

۱۳۔ "کبھی کبھی اسے ایسا محسوس ہوتا کہ ہوا میں بہت اپنی لٹکی ہو۔ اور ہوا نیچے ہوا، دائیں ہوا، بائیں ہوا۔ بس ہوا ہی ہواستے اور پھر اس ہوا میں دم گھٹنا بھی ایک خاص مزادیتا ہے" (ہنک)

۱۴۔ "فضا میں نیندیں گھلی ہوئی تھیں، الیسی نیندیں جن میں بیماری زیاد ہوتی ہے اور انسان کے ارد گرد نرم نرم ثواب یوں پڑ جاتے ہیں جیسے اونی کپڑے۔" (دھوان)

۱۵۔ "میں نے ان چیزوں سے اس کے بالوں میں کنگھی کرنا شروع کر دی۔ میں یہ خسوس کرنے لگا کہ اس کے یال میرے اب تھے ہوئے خیال میں جن کو میں اپنے ذہن کی ان چیزوں سے ٹوٹ لے دیا ہوں۔"

۱۶۔ اسے صرف اپنے آپ سے سفری تھی اور بس دوسردیں کی جنت پر وہ ہمیشہ اپنی دوزخ کو تربیح دیتا تھا؛" (نیا سال)

۱۷۔ "محبت ایک عام چیز ہے۔ حضرت آدم سے یہ کہ ما سڑ نہاد نکل سب محبت

منٹو کا من

کرتے ہیں (تبغ)

۱۸۔ "زندگی کیا ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک ادنی جواب ہے جس کے دھاگے  
کا ایک سراہمارے ہاتھ میں دے دیا گیا ہے۔ ہم اس جواب کو ادھیرتے ہتے  
ہیں جب ادھیرتے ادھیرتے دھاگے کا دوسرا سراہمارے ہاتھ میں آجائے  
گا تو یہ طسم جسے زندگی کہا جاتا ہے ٹوٹ جائے گا (مصری کی ڈلی)  
منٹو کے اذانوں کے یہ متفرق اقتباسات اس کے انداز بیان کے مختلف  
پہلو دن کی دھماحت کرتے ہیں۔ مثال بہر ۲ میں منگو نے جب یہ بات کہی کہ ایسی  
خبر سن کر جی خوش ہو جائے تو یہ مسحول سی بات تھی لیکن یہ بظاہر مسحول ہونے والی  
بات منگو کے نزدیک بہت ام کھی۔ منٹو نے منگو کے مزاج، اس کی ذہنی سطح اور  
گنجے سنتھو کی مختلف خصوصیتوں کو جمع کر کے ایک ایسا جملہ لکھا جو منگو کی ذہنی گیفت  
کی پوری تر جہان لرتا ہے۔ منگو کی جد باقی شدت کے ابلار کے لئے منٹو نے جو جملہ  
 واضح کیا ہے وہ منٹو کا منفرد زنگ ہے۔ ایک چلتے ہوئے غیر سخیدہ فقرے کو ایک  
بے حد ایم اور گہرے مفہوم کا حامل اور ترجمان بنانا منٹو کے جدت پندا سوب  
کی ایک خصوصیت ہے۔

مثال بہر ۲ میں پڑھنے والے کے سامنے جو کشیہ آتی ہے اسے دیکھ کر پڑھنے  
والے کو اس کے نئے چن کا احساس تو سفر درستہ ہوتا ہے لیکن دہ سوچتا ہے کہ اس کشیہ  
میں کوئی ایسی غیر مسحولی بات نہیں ہے کہ منٹو کے سوا کسی اور کا ذہن اس تک نہ پہنچ سکتے

لیکن منڈو یہ کہتے ہیں کہ آپ نے سے دھیلے اند پتھر مار کر انہیں گرا سکتے ہیں تو پوری قبیلہ پر منڈو کے منفرد اند امتیازی اسادب کا ذمگ چھا جاتا ہے اس لئے کہ یہ جملہ جو خیلی یانہ بان کے اقتدار سے با محل معمول سا اور چلتا ہوا ہے بازاری خروت کے کردار اور اس کی ہاں خصوصیات کو پوری طرح بے تھاب کر دیتا ہے جو اس جماعت کی خود توں کی زندگی کا امتیاز سمجھی جاتی ہیں۔

تیسرا مثال میں ابتدائی ٹکڑے میں شاہزادہ کی جو باریک بینی ہے دہ تودا پنی جگہ منڈو کے حاذ نکر کی ایک خصوصیت ہے لیکن جس عورت کے ہاتھ سے دہ مرد ڈیاں پہنچ رہی تھیں اس کے لئے منڈو کے دل میں لگن بھی ہے اور نفرت بھی۔ اس لگن اور نفرت کا اظہار کرنے کے لئے اختر لکھنے والوں کو بیڑ نکل میں خود طرزی کر کے نہ جانے کیسے کیسے گوربر آبلد نکلنے کی نظر ہوتی ہے۔ لیکن منڈو کے پاس شدید سے شدید جذب کے اظہار کرنے سے آسان نفط مہ جو دہیں اور ان لغتوں کو ایک ایسی ترتیب دیتا کہ جملے کی طاہری چشت توسلاہ دھیر ہو جائے لیکن اس کی معنویت کئی گز زیادہ ہو جاتے۔ منڈو کی تدریباً بیان کا ایک ادنیٰ کوشش ہے۔ ادنیٰ اس لئے کریے کر شکر کبھی کبھی نہیں ہمیشہ ظہور پذیر ہوتا رہتا ہے۔

پی صدت مثال بزرگ کی ہے۔ جمال منڈونے اسی طرح کی ایک اور خروت کا ذکر کیا ہے جو ان کے نزدیک تابل نفرین ہے۔ اگر ایسے لغتوں کے ذریعے ظاہر کی جاتے ہوں تو یہی طریقہ جذب نفرت کے منہج ہوں تو بیان میں عمرست آجائے۔ منڈو نے اپنے

انماز کو ہمیشہ موریت سے بجا یا اور سادگی بیان کو گری معزیت کا ز جان بنایا ہے  
مثال مبہر پا پنج تا نز ایگزی کی خصوصیت کے لحاظ سے اپر کی دلنوں شاون  
سے طقی جلتی ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ یہاں پیپر ٹنٹ کی ایک سادہ سی مثال نے  
پڑھنے والے کے لئے بھی شو شو کے نام میں دہی ندت پیدا کر دی ہے جس سے انماز  
نکار کا دل پوری طرح آشنا ہے۔

بھھٹی اور سائزیں مثال منٹو کے انماز بیان کی ندرت اور تدرت کلام کے اس پیپر  
کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ منٹو انسانی ذہن کے شدید سے شدید تاثرا دساں کے دل  
کے نازک سے نازک اور لطیف سے لطیف جذبہ کا بیان ایسے لغتوں میں کر دیتے ہیں  
کہ دہ شدید تاثرا در نازک اور لطیف ہندبہ جسم ہو کر پڑھنے والے کے سامنے جاتا  
ہے۔ ایک غیر مرثی اور غیر مادی حس ایک ٹھوس اور مرن حقیقت بن کر نظر کے سامنے  
آتی ہے۔

آٹھویں اور نویں مثالوں میں منٹو نے دنئے تعورات پیش کئے ہیں۔ باجھو اور  
استھاط کا ایک واضح لغتی مفہوم ہمارے ذہن میں موجود ہے۔ اس لئے منٹو جب  
مجت کئے یہ ہوتے ہیں کہ دہ باجھ ہو سکتی ہے۔ اس کا استھاط ہو سکتی ہے تو ہمارا  
ذہن اس کا جو فوری تاثر بدل کرتا ہے اس میں الجھن اور تکدر کی ایک مل جل کیست ہوتی  
ہے۔ لیکن آہت آہتہ جب دہ نئے ساق و ساق میں ان لغتوں کے مفہوم پر خود  
کر ماشروع کرتا ہے تو اسے عروس ہوتا ہے کہ منٹو نے ایک گرے نسبیتہ خیال کر

اظہار کے لئے دو یا سے لفظوں کا انتخاب کیا ہے جو کسی طرح بھی اس فلسفہ اور پوجھ  
 اٹھانے کے اہل نہیں تھے۔ لیکن منٹو کی چاکرہ ستی کی بدلت ان دونوں معمولی اور جنگی  
 لفظوں کی حیثیت بالکل بدل گئی۔ انہوں نے نہ صرف ایک ایسی حقیقت کا اظہار بلکہ  
 بڑی کامیابی سے کر دیا جس کے دو اپنی ذاتی حیثیت سے دو اہل نہیں تھے بلکہ پڑھنے  
 والوں کے لئے سوتھ بچار کے وہ دارے بھی کھوں دیئے۔ منٹو کے اسلوب کی جدت پسندی  
 نے بہتر اوقات پھوٹے لفظوں سے بڑا کام یا سے ادا اس طرح معمولی لفظوں میں وقوع  
 طور پر ایک گہرا اور گیرائی پیدا ہرگئی ہے۔ یہی صورت ان دونوں مثالوں میں ہے۔  
 دسویں سے یک پسند رحمویں مثال تک ہر جملہ مختصر ہے بہت نزدیکی ساتھ منٹو  
 کے طرز اور اسلوب تکارش کی اس خصوصیت کا حامل ہے کہ وہ کسی کردار کی ذہنی گیفت  
 کی ساری شدتیں اور گہرا یہیں تو بھی بالکل سادہ جملوں سے کبھی ایسی تشبیہیں اور مثالوں  
 سے جو درستے لکھنے والے کو تلقیناً اس موقع پر بے عمل معلوم ہوئیں۔ جہاں منٹو نے انہیں  
 کامیابی سے برنا ہے اور کبھی بہت سی ملی جلی واضح تصویر دی سے اس طرح بیان کر  
 دیتے ہیں کہ پڑھنے والا کسی طرح کی حرمت کے بغیر اس خدماتی شدت اور گہرا ای کا مکمل  
 تکمیل کر لیتا ہے۔ دل کی بات ایک زندہ اور مریٰ حقیقت بنکر اس کے ساتھ آ  
 کھڑی ہوتی ہے اور بالاعلان کہتی ہے کہ دیکھو یہ میں ہوں مجھے اچھی طرح پہچان لو اور  
 دیکھنے والا ایک ہی نظر میں اس زندہ حقیقت کو اس طرح پہچان لیتا ہے کہ وہ اس  
 کے لئے ناقابلِ زراموش بن جاتی ہے۔

سو ہمیں مثال میں منٹو کے اسلوب کی خصوصیت نمایاں ہے کہ کسی داقعہ یا کردار کے سلسلے میں قاری کو کوئی خبر سننا کر نوراً ایک دوسرے جتنے سے اس خبر کی دفاحت کرتے ہیں اور اس دفاحت کے بعد داقعہ کا وہ پہلو یا کردار کی دہ مخصوص کیفیت جس کا بیان مقصد ہے۔ آئینہ کی طرح رد شن اور سورج کی طرح تابان ہو گر سامنے آجائی ہے۔

ستھویں مثال بھی اسی طرح کی دفاحت کی ایک دوسری شکل ہے یہاں انسان نگار نے ہمیں ایک خبر پہنچ کر جدت ایک عام چیز ہے اور اس خبر کی دفاحت کے لئے جو مثال پیش کی دہ بلطاءہر مذاق اور طنز کی ایک مددوم ہونے کے باوجود داس قدر منطقی ہے کہ سننے والا اسے جھوٹلانے کی براحت نہیں کر سکتے منٹو کے فلسہ کی طرح ان کی منطق بھی غیر معمولی بہادر دل کی مخالع نہیں۔ یہاں بھی سادگی بیان اور اعم نزین بات کو حد درج معمولی تمجھ کر اس کی اہمیت بڑھانے کی خصوصیت برابر کار فراہم ہوتی ہے۔

آخری مثال میں بھی منٹو کے نگرا در اسلوب کی اسی خصوصیت کی ایک ایسی اور امتزاج ہے جہاں پہرے خیال اور سی جھی سادی عبارت اور معمولی سی لشہریہ کو اس طرح ایک ہی زنجیر کی کڑ بابی بنایا جاتا ہے کہ پڑھنے والا سوچنے لگتا ہے کہ گھری یا تیس اور نلسپیا نہ حقیقیں واضح کرنے کا بہترین اور موثر نزین انداز دہ ہے جسے منٹو نے اپنایا ہے۔

منڈونے اپنے انسانوں میں سیدھے سادسے روزمرہ کی بول چال کے جلوں سے الی  
شالوں اور تشبیوں سے جود دسردیں کی نظر میں بالکل حیر اور بے حقیقت نہیں اور  
ایسے چلتے ہوئے فردوں میں سے جن میں سبجدگی و متانت کا ثابت ہے تک نہیں بوتا۔ اگری  
سے ہری، سبجدہ سے سبجدہ اور موثر سے موثر بات کرنے کا کام لیا ہے اور ہر جگہ اس  
سادگی اور عمدیت کو تفصید آرین، نکر انگریز اور خیال ازروں لیا ہے۔ پھر بھی بہت  
کم مقامات ایسے ہیں جنہیں پڑھ کر فاری کے دل میں یہ بات آتی ہو کہ دسردیں کے  
بھر اور تحمل کی مشتمل ہلانے والے منڈونے یہ باتیں کرنے کے لئے اپنے ذہن پر زد دیا  
ہے۔ منڈونے جو کچھ کہا ہے اس میں آوردنام کو نہیں ایک الی آمد ہے جو شخصیت  
کے زور اور اس کے بے لوث خلوں کی مظہر ہے۔ منڈو کے پورے اسوب پر ہی  
بیٹھ لکھن اور بے ساختگی چاہی ہوئی ہے۔ اس کا پر تو ہیں منڈو کی ان تشبیوں میں بھی نظر آتا  
ہے جو اس کے ترکش فن کے بڑے جیدا فگن تیر ہیں۔

ایسے تیروں کی منڈو کے ترکش میں کوئی کمی نہیں۔ بے شمار تشبیوں میں سے چند پر  
نظر ڈال کر اندازہ لگائیں کہ منڈو کا ہمہ دنگ اور ہمہ صفت فن ان تشبیوں میں سے  
کب کب اور کب کب طرح کام لیا ہے۔

اُستاد منگونے فوجی گوروں کے چہرے کا جو تھور پیش کیا ہے وہ کس قدر  
مکر دہ اور گھناؤ نا ہے:-

”ان کے لال جبریوں جھرے چہرے دیکھ کر مجھے وہ لاش یاد آجائی

ہے۔ جس کے جسم پر سے اور پر کی جعلی گل گل کر جبر رہی ہو۔

(نیا قانون)

منٹو کے دل میں (یا منٹو کے کسی کردار کے دل میں) کسی پیر کسی فاقہ یا شخص کا جو نقصہ ہے اسے دوسرا سے کے ذہن تک جوں کا توں پوری طرح مستقل کرنے کے لیے منٹو کے پاس الفاظ افقر و ادر جملوں کی کمی نہیں۔

اسی طرح ان کا ذہن نازہ مشکل سے مشکل ذہنی اور جذباتی سمجھ پر کو اس کی محل نزکتوں اور رعائتوں کے ساتھ دوسرا دل تک پہنچانے کے لیے ایسی تشبیہیں دینے کر لیئے پر قادر ہے جن کی طرف کسی اور کا ذہن مستقل بھی نہیں ہوتا۔ یہی خصوصیت اور پر کی مثال میں ہے۔

منٹو جس طرح الفاظ اور جملوں کے ذریعہ محبت، نفرت، حقادت، رشک، حسد، خلوص، صداقت اور رحم و کرم کے احساسات میں فاری کو پوری طرح اپنا ہمزا بناسکتے ہیں اسی طرح تشبیہوں کی مدد سے اور اکثر بالکل معمولی سموی تشبیہوں سے وہ بہ طریقہ کے اساس اور جذبہ کو اس طرح جنمایا جائے کہا کر پڑھنے والے کے ذہن میں اُنمار دیستھنے کہ وہ جذباتی طور پر اپنے آپ کو افانہ نگار کے پروردگر دیتا ہے۔

آئت دلگوں کی زبان سے مار دار یوں کو عزیزوں کی کیا میں گئے ہوئے کھشن کھبوانے اور اس بات کو اس طرح مکمل کرنے میں کہ ”نیا ناؤن ان کے لیے کھوئا ہوا پانی ہو گا“ منٹو کے فن کی خصوصیت ملایاں ہے۔

جب اُستاد منگو کی نگاہیں گورے کی آنکھوں سے چار ہو میں نواہیا معلوم ہوا  
کہ یک دلت آئے سامنے کی بندوقوں کی گولیاں خارج ہو میں اور اپس میں ٹکرایا  
کہ ایک آتشیں بگولا بن کر اُدپر کو اڑ گئیں۔ بندوقوں سے نکلی ہوئی گولیوں کی تشبیہ  
میں کوئی نئی بات نہیں لیکن اس کے برمحل صرف نے ایک شدید احساس کو ایک  
 واضح اور ٹری ہوئی شکل دے دی ہے۔

ایسی تشبیہیں جن میں یوں بظاہر کوئی نیا پن نہ ہو ددمردی کو اپنی طرف توجہ  
نہیں کر سکتیں لیکن منٹو کا در درس تصور ہمہیہ دو چیزوں میں موزوں ترین مشابہت  
تلاش کر کے اسے بڑی برجستگی سے صرف کرتا ہے اور ایک معقولی اور بظاہر بے حقیقت  
سی تشبیہ ایک مکمل مفہوم کی حامل اور ایک گھرے سنجھے کی عکاس بن جاتی ہے۔

بندوقوں سے نکلی ہوئی گولیوں بیی اور بہت سی سیدھی سادھی لیکن ایسے ناثر کے  
لحاظ سے اہم تشبیہیں منٹو کے ہر افسانہ میں قدم قدم پر ملنی ہیں۔

ایسی چند مثالیں ملاحظہ کیجئے:-

” وہ بڑی خوذ اک عورت تھی۔ اس کا منہ کچھ اس انداز  
سے کھلتا تھا جیسے یہیوں نجور نے دالی میشیں کا کھلتا ہے۔“

(پہچان)

”اس کی آنکھیں مست سیں اور ہونٹ تلوار کے تازہ زخم کے  
مانند کھلے ہوئے تھے۔“

(شو شو)

خوشیا کے مردانہ دقار کو اس بات سے سخت دھکا لگا ہے کہ کاناتا بہنہ اس کے  
سانے آ کر کھڑی ہو گئی اور اپنی اس حرکت کا جواز اس نے یہ کہہ کر پیش کیا کہ ”کیا ہر جو  
ہے اپنا خوشیا ہی تو ہے۔“ یہ بات خوشیا کے دماغ میں طرح طرح کے روپ بھر کر  
اسے ستاتی اور پیشان کرتی ہے۔ ان بے شمار روپوں میں سے ایک یہ ہے:-  
”خوشیا نہ جوا سالا وہ بلا سو گیا جواں کے لبتر پر پر وقت اُذنجھتا  
رہتا ہے۔“

(خوشیا)

”بانجھ“ میں ایک منظر کا لقotor منٹو نے اس طرح پیش کیا ہے:-  
”کبھی کبھی کسی آنے یا جانے والی موڑ کے ہارن کی آداز بلند برقی  
اور یوں معلوم ہوتا کہ بڑی دلچسپی کیا فی سننے کے دران کی نے  
زور سے ”ہوں، کی ہے۔“

یہ تشبیہ بھی غیر مولی نہ ہی بلکن اس تک منٹو کے سو اکسی اور کے ذہن کی نارساں  
اسے غیر مولی بھی بنادیتی ہے اور منٹو کی فنی عنقدت کی طرف اشارہ بھی کرتی ہے۔  
”گالی ————— یوں سمجھئے کہ کافوں کے راستے پچھلا

ہوا سیہ شامیں کرتا اس کے دل میں اُتر گیا۔

(لغہ)

”بار بار یہ دو گالیاں جو سیدھے نے بالکل پان کی پیک کے ماندے اپنے منہ سے اُگل دی تھیں، اس کے کافوں کے پاس زبردیی چبرڈی کی طرح بنبخانا شروع کر دیتی تھیں۔“

(لغہ)

”دو گالیاں — اس کے جی میں آئی کہ اپنے سینے کے اندر ہاتھ ڈال کر وہ ان دو چبرڈی کو جو کسی چلے گلتے ہی نہ تھے، باہر نکال لے۔“

(لغہ)

ایک گالی یاد دو گالیاں — میرے اور آپ کے بیٹے دو سنی سنائی بے حقیقت باتیں ہیں۔ جتنیں آدمی صبح سے شام تک ہر ایک کے منہ سے نکلنے سناتے ہیں۔ لیکن کیشو لال کے دل میں ان گالیوں نے جواہر کیا ہے۔ اس کی شدت اور تڑپ کو منٹو ان گفت تشبیوں کے ذریعہ پوری طرح واضح کر دینے پر قادر ہے۔ اور پر کی چار دل تشبیوں میں کوئی نیا پن نہیں۔ لیکن ان فرسردہ تشبیوں سے منٹو نے پار بار جو کام کیا ہے اس سے محویت میں خصوصیت پیدا ہوئی ہے۔ ہر طبقت میں گمراہی آئی ہے۔

منٹو نے ایک ہی تشبیہ سے ایک بہت ویسے منظر کی تصویر کیجئے اور فنا فام کرنے کی جو خدمت ل اس کی چذا اور تصویریں دیکھئے۔ پہلی دونوں تصویریں ”دھواں“ کی ہیں۔

”موسم کچواليں جی کہنیت کا حامل تھا جو رہر کے جوتے پین کر  
چلنے سے پیدا ہوتی ہے۔“

(دھواں)

”ایک کبوتر اور کبوتری پاس پاس پڑھلاۓ ہے بیٹھتے تھے  
ایسا سلام بہتا تھا کہ دو توں دم سُپت کی ہر ہی بندیا کی  
طرح گرم ہیں۔“

(دھواں)

”دو پکھے اس طرح سمٹ جیسے کسی نے بلندی سے ریشی کپڑے  
کا تھان کھول کر پیچے پیک دیا ہے۔“

(صریح کی کڈی)

دو ایک مزے دار تشبیہیں اور دیکھئے اور اندازہ لگائیں کہ منٹو چیزوں کو کیسے کیے  
گئے ہیں میں سے نکال کر منظر عام پلاتا اور پڑھنے والے کے ذہن کو ہر دم ایک نیا نقش  
بنانے میں مدد دیتا ہے۔

”یہ اسٹوک کار بھی بیک پیز ہے بردے پر عشق کرتا ہے تو

منٹو کافن

تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سڑاکیل پر رہا ہے۔"

(سجدہ)

"اپنے آپ کو چھپا نے کی چونڈی کوشش میں وہ ایک ایسا  
بنے جان لطیفہ بن کر رہ گیا تھا جو بڑے ہی خام انداز میں سنا یا  
گیا سو۔"

(سجدہ)

"وہ کرسی پر اس انداز میں اکیلانا بیٹھا تھا جیسے شظر سنج کا پلا ہوا  
مہرہ باط سے بہت ددر پڑا ہے۔"

(سجدہ)

"اس کی شرارت اب دسم کئی گلہری بن کر رہ گئی تھی۔"

(سجدہ)

"نئے سال کی آمد پر وہ خوش تھا۔ جیسے اکھاڑے میں کوئی  
نامور پہلوان اپنے نئے م مقابل کی طرف خم ٹھونک کر رہتا  
ہے۔"

(نیا سال)

یہ سب تشبیہیں ٹپھنے والے کے تصور اور تحلیل کو زندگی کی ایک لہر دے کر اسے ایک

ایسی تصور بنا نے میں مدد دیتی ہیں، جس کا ہر رنگ تیکھا اور برقش دامنخ ہے۔

منٹو کی تشبیہوں کا یہ امتیاز ہے کہ ان میں سے کوئی زندگی کی نژاد پادری سے خالی نہیں ہر تشبیہ کے پیچے ایک مکمل ادرا منج تصور چھپی ہوئی ہے جسے منٹو کی فنی چاکدستی اس طرح بر محل استعمال کرتی ہے کہ پڑھنے والا اس تصور کا پورا تاثر قبول کرتا ہے اور دبی زہنی اور جذبہ باتی تا بچ اخذ کرتا ہے جو افانہ نگار کے ذہن میں نہیں۔

منٹو کا اسوب افہار جس میں الفاظ، فقردوں اور تشبیہوں کو یہاں ابھیت ہے محل تاثر کی تخلیق کو اپنے نصب العین بناتا ہے۔ اور شاید بہت کم موقعے ایسے ہیں جن پر اسے اپنا فنی معمود حاصل کرنے میں پوری کامیابی حاصل نہ ہوئی ہے۔

اس کی اس کامیابی میں تشبیہوں کے علاوہ ایک اور خاص چیز کو محی دخل حاصل ہے۔

اور وہ ہے 'تکرار'۔

'تکرار' مشرقی اسوب افہار کی ایک الیک خصوصیت ہے جسے نثر سے زیادہ نظر میں بتا گیا ہے لیکن اردو اور فارسی میں عموماً 'تکرار' کو ایک لفظی صفت کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ اس لفظی صفت سے لکھنے والوں نے عموماً سوتی ترم اور تاثر انگریزی کا کام یاد ہے۔

گوئیں کبھی کبھی یہ تاثر بعض صوتی ترم و تاثر کے علاوہ جذبہ باتی کیفیت کے افہار کا اولیٰ

بھی بتا ہے۔

نثر میں مختصری اسالیب کے اثر سے لفظوں اور فقردوں کی تکرار خاصی عام ہو گئی

ہے۔

چنانچہ بخار سے افانہ نگاروں کے یہاں جا بجا اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ لیکن کسی افانہ نگار نے انہمار کے دسید کو اپنے فن میں اس طرح شامل نہیں کیا۔

جیسے منٹونے۔ منٹو کے مشہور افناوں میں سے د خوشیا، الغره، بلاوز، بٹک، سیاقاون، اور سبتا کم معروف افناوں میں الوکا پھا، اور قبقني، اس فن کے پڑے کامیاب مظہر ہیں۔

الغره، میں کیشور لال اپنے سینٹھ کے ساتھی منزل والے بالاخانے سے یونچے اُرزا تو افانہ نگار کے لفظوں میں:-

”اسے یوں محوس ہوا کہ اس سنگمن عمارت کی ساتوں منزلیں اس کے کاندھوں پر دھردی گئی ہیں۔“

اس یہے کہ دو ہمینے کا کراپر اداز کرنے کی سزا میں سینٹھ نے اسے دو گالیاں دی تھیں اور وہ گالیاں اس کے پورے وجود میں سماں جا رہی تھیں۔

ان گالیوں سے کیتو لال کے دل پر جو کچھ بیت رہی ہے اس کے انہمار کا بہترین ذریعہ منٹونے تکرار کو بنایا ہے۔ یہ گالیاں اس کے ذہن اور جذبات بلکہ اس کے وجود پر کس طرح چائی ہوئی ہیں اس کی تفصیل منٹو کی زبانی سُنبئے:-

”————— مالکِ مکان نے غستے میں آکر اس کو گالی

دی ————— گالی ————— یوں سمجھئے کہ کافیں کے

راستے پھلا ہوا سیسہ شاہین کرتا اس کے دل میں اُثر  
گیا اور اس کے بیٹنے کے اندر جو بلڑ پچ گیا اس کا تو کچھ ٹھکانہ ہی  
نہ تھا۔

---

”اس کے جی میں آئی کہ اس گال کو جسے وہ بڑی حد تک نگل چکا  
تھا، سیٹھ کے جھر دیں جھرے چھرے پوتے کر دے مگر دہ اس  
خیال سے باز آگی کہ اس کا عذر تو باہر فٹ پاتھو ہر پڑا ہے۔“

---

”سیٹھ نے اسے چھر گال دی۔ اتنی موٹی جتنی اس کی جربی جھری  
گردن تھی۔ اور اسے یوں لگا کہ کسی نے اُپر سے اس پر کوڑا  
کر کٹ چینیک دبا ہے۔“

---

”ایک بھیں دو گالیاں — بار بار یہ دو گالیاں جو سیٹھ نے  
باکل پان کی پیک کے ماندہ اپنے منہ سے اُگل دی تھیں اس کے  
کاون کے پاس زبری بھر دیں کی طرح بھینبھانا مشرد ع کر دیتی  
تھیں اور وہ سخت بله ہیں سو جاتا تھا۔“

---

منو کافن

چلنے چلنے ایک لگڑے کتنے سے اس کی تکر ہوئی۔ کتنے نے  
اکس خیال سے کہ شاید اس کا زخمی پیر کھل دیا گیا ہے ”چاؤں، کی  
ادر پرے بہٹ گیا اور وہ سمجھا کہ سیٹھ نے اسے پھر گالی دی ہے  
— گالی — گالی ٹھیک اس طرح اس سے الٹو کر  
رہ گئی تھی جیسے حبڑ بیری کے کانٹوں میں کوئی کپڑا وہ جتنی کوشش  
اپنے آپ کو حفڑا نے کی کرتا ہے اتنی بی زیادہ زخمی ہوتی جا رہی  
تھی۔“

”سیٹھ نے ایک گالی دی اور وہ پکھونہ بولا۔ — دوسری  
گالی دنی تو بھی وہ خاموش رہا جیسے وہ مٹی کا پتلا ہو۔ —  
پر مٹی کا پتلا کیسے ہوا؟ اس نے ان دو گالیوں کو سیٹھ کے غریب  
بھرے منز سے نکلتے دیکھا، جیسے دردبارے بڑے چوپے موریوں  
سے باہر نکلے ہوں۔“

”جب اس کے سامنے ایک موڑنے اپنے ماتقے کی بنتیں روشن  
کیں تو اسے ایسا معلوم ہوا کہ وہ دو گالیاں پھل کر اس کی آنکھوں  
میں دھنس گئی ہیں۔“

”گالیاں — گالیاں — کہاں تھیں وہ  
گالیاں؟ اس کے جی میں آئی کاپنے سینے کے اندر لامتحہ ڈال کر  
وہ ان دو پھر دل کو جو کسی جیلے گئے ہی نہ تھے، باہر نکال لے  
اور جو کوئی بھی اس کے سامنے آئے اس کے سر پر دے مارے۔“

---

”اس نے ماخ میں آگ کا ایک چکر سابن گیا۔ اس چکر میں  
اس کے سارے پرائے اور نئے خیال ایک ٹار کی صورت میں  
گندھ گئے دو مہینے کا کرایہ، اس پھر کی بلڈنگ میں درخواست  
لے کر جانا — سات منزلوں کے ایک سو بارہ  
زیست، سیٹھ کی جدی آواز، اس کے سر پر سکراتا ہوا بھل  
کا بب اور — یہ موٹی گالی — پھر  
دوسروی اور اس کی خاموشی — یہاں پہنچ کر آگ  
کے اس چکر میں تڑ تڑ گولیاں ہی نکلن شروع ہو جائیں اور  
اسے الیا محروس ہوتا کہ اس کا سینہ چپنی ہو گیا۔“

---

”لغہ“ میں گالیوں والے واقعہ کی تکرار سے منٹونے آہستہ آہستہ کبتو وال کے ذہنی  
اور جذباتی ہیجان کو واضح کرنے میں مدد لی ہے۔ اور اس تکرار اور ٹربتے ہوئے ہیجان

میں مکمل ہم آہنگ پیدا کر کے اس انجام کے لیے غصیاتی اور فنی جواز پیدا کیا ہے جس میں کیشو لال کے دل کا سارا درد اور اس کی شخصیت کا سارا کرب و اضطراب سخت کر وہ نفرہ بن گیا۔ جس سے کیشو لال کے دل کو ضرور تکین مل گئی۔ لیکن سننے والوں نے صرف یہ تبصرہ کیا۔

کہ ”پگلا ہے“

منہو اپنے فن میں افناہ کی عہدید، اس کی اٹھان، اس کے لفظ عرب زبان اور اس کے انجام کو جواہریت دیتے ہیں اور ان مختلف مراحل کے درمیان پورے خلوص اور انہاک سے ربط اور سلطہ کا جو رشتہ قائم کرتے ہیں، وہ لغڑہ، میں گایوار کے ذکر کی تکرار سے پورا ہوا ہے۔

تکرار ہی نے اس افسانے میں ایک خاص کردار کی ذہنی کیفیت کے اضطراب کی صوری کی ہے۔ تکرار ہی نے افسانہ کو آہنہ آہنہ اٹھان کی طرف لے جا کر ایک سوچے سمجھے انجام تک پہنچا یا ہے۔ اور تکرار ہی نے اس تاثر کی تکمیل کی ہے جو قاری کے نقطہ نظر سے اس کا مقصد ہے۔

” بلا کوز“ شبب کی نازک اور جال گداز منزل میں قدم رکھنے والے مومن کی اس جنسی بیداری کی کہانی ہے۔ جس کے معنی اسے خود بھی اچھی طرح معلوم نہیں۔ اس نازک غصیاتی موضوع کی کہانی منہو نے چند تاثرات اور تصورات کو ایک سی لڑائی میں پروردگار تصورات کی تکرار کی زبانی سُننا ہے۔ اس کی ابتداء یوں ہوتی ہے کہ ایک دن مومن

”شکر کی سفید بغل میں کالے کالے بالوں کا ایک گچھا نظر آگیا — یہ گچھا اسے بہت بھلا محلوم ہوا۔ ایک سننی سی اس کے سارے بدن میں دور گئی۔ ایک عجیب و غریب خواہش اس کے دل میں پیدا ہوئی کہ یہ کالے کالے بال اس کی مونکپیں بن جائیں۔“

مومن کے دل میں اس کے بعد دھندے دھندے خیالات پیدا ہوتے رہے لیکن وہ ان کا مطلب سمجھنے سے قاصر رہا اور آخر ایک دن جب اس نے اپنا ٹرینک کھول کر اپنے عین کے یہے بخے ہوئے کپڑوں پر نظر ڈالی تو:-

”روزی ڈپی کا خیال آتے ہی اس کے سامنے اس کا چند نا آ گیا اور چند نا فوراً ہی ان کالے کالے بالوں کے گچھے میں تبدل ہو گی جو اس نے شکر کی بغل میں دیکھا تھا۔“

ادر پھر کرہ صاف کرتے ہوئے اس نے سانچ کی چکیں کترنی اپنی جیب میں رکھ لیں اور اگلے دن یوں ہی الگ بلیٹھ کران کے دھاگے الگ کرنے شروع کر دیئے:-

”حتیٰ کہ دھاگے کے چھوٹے بڑے ٹکڑوں کا ایک گچھا سابن گی۔ اس کو ہاتھ میں لے کر دہ دباتا رہا۔ لیکن اس کے تصور میں شکر

کی دہی بغل تھی جس میں اس نے کالے کالے بالوں کا ایک چھوٹا سا  
گچھا دیکھا تھا۔“

---

اس کے بعد وہ جب بھی اندر آ کر بلا دُز کو دیکھتا تو۔

”اس کا خیال فوراً ان بالوں کی طرف دور جاتا تو اس نے  
شکید کی بغل میں دیکھتے تھے اور بالا خراپیک رات کو۔“

”جب وہ سویا تو اس نے کئی اڈ پانگ خواب دیکھتے ڈپی  
صاحب نے پھر کے کوئوں کا ایک بڑا دھیر اس سے کوئی  
کو کہا۔

جب اس نے ایک کوئلہ اٹھایا اور اس پر میکھوڑے کی  
صرب لگائی تو وہ نرم نرم بالوں کا ایک گچابن گیا۔ یہ کالی  
کھانڈ کے مہین مہین تار تھے۔ جن کا گولہ بننا ہوا تھا۔ پھر یہ  
گولے کاتے دنگ کے غبارے میں کر ہوا میں اڑنے سے شروع  
ہوئے۔ بہت اور پر جا کر یہ چھٹنے لگے۔ پھر آندھی آگئی اور  
مومن کی روی ٹوپی کا چند ناکہیں غائب ہو گیا۔ چند نے کی  
تلکش میں نکلا۔ دیکھی اور ان دیکھی جگہوں پر گھومتا رہا۔  
کالی سائن کے بلا دُز پر اس کا ہاتھ ٹپا۔ کچھ دیر تک وہ کسی

دھڑکتی ہوئی چیز پر اپنا نام تھا پھر تارہ پھر دفتہ بڑبڑا کے انہم

بیٹھا۔ تھوڑی دیر تک وہ کچھ نہ سمجھ سکا کہ کیا ہو گیا ہے۔

اس لغایاتی افسانے کی فنی ترتیب، اس کے اٹھان، اس کے ارتقاء، اس کے منتها اور اس کے انجام اور پھر سب کے باہمی ربط اور توازن میں منٹو نے ایک خاص تصور کی تحرار کو فن کی بنیاد بنا یا ہے افسانے کے مرکزی کردار نے ذہنی لکھش کے جو مراحل میں کئے ہیں۔ ان کے انہمار کے اور طریقے بھی ہو سکتے تھے۔

لیکن منٹو کے اس افسانے کو پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ افاذنگا رنے تصورات کی جس تحرار کو ایک خاص تاثر پیدا کرنے کا فنی وسیلہ بنایا ہے وہی وسیلہ اس مقصد کے حصول کا بہترین دریغہ ہو سکتا تھا۔

فنکار کی جیشیت سے منٹو نے اپنے یہے امتیاز محفوظ کیا ہے کہ جب کسی خاص محل پر وہ کسی فن اسلوب سے کوئی تاثر پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو وہی فنی اسلوب اس محل کا بہترین اسلوب معلوم ہوتا ہے۔

دغہ، اور 'بلاؤز' کی مشاول سے منٹو کے فن میں تحرار کی جس اہمیت کی دعالت ہوئی ہے وہی ایک نئے اسلوب سے 'بہتک'، 'خوشنما'، 'اوکاچھا'، اور 'قبعنی' جیسے افسالوں میں بھی اُجاتگردی کی دعالت دیتی ہے۔

منٹو نے 'تحرار' کی طرح دتفناد، کو بھی اپنے تاثرات کے انہمار کا ایک وسیلہ بنایا ہے اور اسے طرح طرح سے اپنے افسالوں میں برداشت کے۔ ہماری سیاسی،

معاشرتی اور اخلاقی زندگی میں قدر و کام کا جو حیرت انگیز تفاصیل ہے اسے منٹونے  
بھی شہر بڑے اندر لیشے اور تشویش کی نظر سے دیکھا اور اپنے افزاں کے ذریعہ اس تفاصیل  
کو غایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔

سماں کے مختلف طبقوں میں اُد پچ نیچ اور معاشرتی و معاشی کشمکش ، زندگی کے  
متعلق دو مختلف افراد کے خیالات اور نظریات میں اختلاف اور رضد ، ایک ہی فرد کے  
ظاہر و باطن میں بدیہی فرق اس تفاصیل کی لعین غایاں شکلیں ہیں ۔

منٹونے اس تفاصیل کو اور اس کے علاوہ زندگی کے مختلف شجوں میں ظاہر ہونے  
والے ہر ایسے تفاصیل کو جو انسان کو فریب میں مبتلا کرتا اور اس کے سکون و صرفت کی بر بادی  
کا باعث بتا ہے ، ایسے اسلوب ادا سے جس میں لفظ ، فقرے اور افنا نے کے مختلف  
اجزاء مل جل کر ایک خدمت انجام دیتے ہیں ، بے تعاب کیا جے ۔

تفاصیل کی یہ مختلف صورتیں کسی کسی شکل میں ان کے افزاں میں غایاں ہوتی ہیں اس  
کی چند مثالیں ملاحظہ کیجئے ۔

پہلا اقتباس 'نفرہ' کا ہے ۔ جس میں کیشو وال کے جذبات کی صورتی میں تصورات  
کے اس تفاصیل سے مددی گئی ہے جو طبقات اُد پچ نیچ کا پیدا کیا ہوا ہے :-

”اس گھر کا اندر حایم پکنی بار بجلی کے اس بلب سے ٹکرایا جو مالک مکان کے  
گنجے سر کے اور پسکرار باتا تھا ۔ کئی بار اس کے ہیونڈ لگے کپڑے ان کھوٹیوں پر  
ٹک کر ، پھر اس کے بدن سے چیٹ گئے ۔ جو دیوار میں گڑی چمک رہی تھیں ۔“

اسی طبقاتی تعداد کی ایک شکل 'بلاؤز'، میں اس طرح دکھائی دیتی ہے:-  
 "نوجروں کے متعلّق کون عورت کرتا ہے۔ ہم بچپن سے لے کر  
 بڑھا پے تک وہ تمام منزليں پہلی طے کر جاتے ہیں اور آس پاس کے  
 آدمیوں کو جنم تک نہیں سمجھتے۔"

دو کردار ایک ہی صورتِ حال کو اپنے اپنے جذبات اور لقورات کی روشنی میں کس  
 کس زندگی میں دیکھتے ہیں، اس کا اظہار تک، میں کئی جگہ مادھو اور سوگندھی کے جذبات  
 کو واقعات کی شکل دے لے کریا گی ہے ان کی لقویر دل میں سے ایک یہ ہے:-

"ایک ماہ سے سوگندھی نے پچڑای والے کی لقویر اُنار

دی اور دوسرا ماہ اس فرم کی طرف بڑھایا جس میں مادھو

کا فنوڑ جڑا تھا۔ مادھو اپنی جگہ سوت گیا۔ جیسے ماہ سے اس کی طرف

بڑھ رہا ہے۔ ایک سینڈ میں فرم کیلی سوت سوگندھی کے ماہ

میں تھا:-

زور کا قبیلہ لگا کر اس نے "اوہنہ" کی اور دنوں فرم

ایک ساتھ کمرلک میں سے باہر چینیک دیتے۔ دو منزلوں

سے جب فرم زمین پر گرے اور کاپنے ٹوٹنے کی آواز آئی

تو مادھو کو الا معلوم ہوا کہ اس کے اندر کوئی چیز ٹوٹ گئی

ہے۔ بڑی مشکل سے اس نے ہنس کر اتنا کیا:- اچا کیا۔

مجھے بھی یہ فولوں نہیں تھا۔“

آخری جملہ میں مادھونے جو کچھ کہا ہے وہ اس کے دل کی بات نہیں۔ اس محجوری اور بے لبی ایک پُر فریب جھوٹ کی شکل اختیار کی ہے۔ اس محجوری اور بے لبی اور ظاہر و باطن کے تفاہد کی ایک اور تقویر دیکھئے:-

”مادھوڑ رگی۔ وہ گری ہوئی ٹوپی اٹھانے

کے لیے جھکا تو سو گندی کی گرنج سنائی دی۔ جنبدار۔ پُری رہنے

دے دہیں — تو جا، تیر سے پُنا چھپتے ہی میں اس

کو منی آرڈر کر دوں گا۔“

سو گندی کے اس تلخ طنز بھر سے جعلے میں کئی تفاہد ایک جگہ اگرچہ ہو گئے ہیں ایک تفاہد تو وہ ہے جو سو گندی کے ان جذبات کی شکل میں ظاہر ہوا ہے جن میں حالات نے ایک عایاں تغیر اور انقلاب پیدا کیا ہے۔ دوسرا تفاہد اس طنز میں پوشیدہ ہے جس میں سو گندی کا ایک ایک لفظ دوبارہ ہوا ہے۔ تیرا تفاہد الفاظ کے اس مفہوم سے ظاہر ہے جو گذر سے ہوئے واقعات اور موجودہ صورت حال میں تفاہدم بن کر رونا ہوا ہے۔

”ہنک، کا خاتمہ جذباتی کشمکش کے اس تفاہد کی ایک لغایاتی اور فنکارانہ تقویر

ہے:-

”بہت دیر ہنک وہ بید کی کرسی پر بیٹھی رہی۔ سوتھ بچار کے بعد

بھی جب اس کو اپنا دل پر چانے کا کوئی طریقہ نہ ملا تو اس  
نے اپنے خارش زدہ کتے کی گود میں اٹھایا اور ساگوان کے  
چوڑے پنگ پاسے پھو میں لٹا کر سو گئی ۔

معاشرتی، جذباتی اور نفسیاتی کیفیتوں کے تفاصیل کو ظاہر کرنے پر منٹو کو بہت قدرت  
حاصل ہے اس کے علاوہ ان کے اخوانی میں یہ تفاصیل بعض دوسری لفظی اور معنوی صورتوں  
میں بھی روشنگاہوتا ہے۔

ان کے فن کے دوسرے پہلوؤں کی دنیا سنت کے یہے اب تک بوجہ بہت سی مثالیں  
پیش کی گئیں۔ ان میں بھگ بھگہ اس کے مختلف رنگ چکنے دکھائی دیتے ہیں مثلاً 'بغڑہ' کے  
پورے افسانے میں ابتداء اور انجام کا تفاصیل، دو طبقوں کے اندر کی زندگی کا تفاصیل اور دو  
مختلف آدمیوں کے ایک ہی بات کو دو مستفاد رنگوں میں دیکھنے کا تفاصیل پوری طرح فرمایاں  
ہے۔

اور اس ذکر کو ختم کرتے وقت محبت کے سلسلہ میں منٹو کی کہی ہوئی وہ بات اب  
بھی میرے ذہن میں تازہ ہے کہ حضرت آدم سے ماشر شارمک ہرالنان نے محبت کی  
ہے۔

منٹو کے فن کی وہ ساری خصوصیتیں جن کا تعلق ایک طرف توفن کے ان مطالبات سے  
ہے۔ جنہیں ہم لکھنک کے مبارکات اور اس کے لوازم کہہ سکتے ہیں اور دوسری طرف  
زبان دیسان اور انہلہ دبلاغ کے ان وسائل سے جن کی بدولت افسانہ نگار کا خیال

اس کے تاثرات و تصورات دوسروں کے ذہن اور قلب میں جگہ کرتے ہیں لیکن افسانہ نگار زندگی کے متعلق جو کچھ کہتا ہے۔

وہ صحیح مشاہدہ کی مدد سے اور کسی خاص تجربہ کی تفصیلات میں سے اپنے کام کی جزئیات منتخب کر کے، تفصیلات کا مکمل مشاہدہ اور کسی خاص محل کی ضروریات کے مطابق ان میں سے موزوں جزئیات کا انتخاب، یا افسانہ نگاری کے فن کے بڑے ضروری مطالبات ہیں۔

ہمارے اکثر اچھے افسانہ نگاروں کی مطالبات سے کامیابی کے ساتھ عیندہ براہوئے ہیں فرق صرف یہ ہے کہ ہر ایک نے اپنی مخصوص شخصیت اور منفرد انداز فکر کی بناء پر جزئیات نگاری کا ایک بنا انداز قائم کیا ہے۔ چنانچہ اس خاص نقطہ نظر سے منٹو کا ایک اپنارنگ ہے جو کسی دوسرے کے زندگ سے نہیں ملتا۔

منٹونے سہیشہ کسی واقعہ یا گھردار کے تاثرات و نفعوش کی وضاحت کے لیے ایسی

جزئیات کو زیادہ اہمیت دی ہے جنہیں دوسرے عموماً غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کر دیتے۔ منٹو جس طرح بیان و اظہار خیال کے معاملہ میں اور اپنے تصورات کی وضاحت کے لیے لشہروں کا استعمال کرتے وقت غیر اہم کو اہم اور غیر ضروری کو ضروری اور معمولی کو غیر معمولی پر ترجیح دے کر تاثر کی شدت اور گہرائی پیدا کرتے ہیں۔ اسی طرح جزئیات کے انتخاب کے سلسلہ میں بھی انہوں نے بظاہر غیر اہم و معمولی پہلوؤں پر ترجیح دی ہے اور اپنی تصویر کو خواہ واقع کی ہو یا کردار کی انہیں معمولی رنگوں سے شوخ اور تیکھا بنایا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل چند مثالوں میں

دیکھئے:-

” مارواڑیوں کو ان کے ٹھکانے پہنچا کر اس نے اتار کلی میں دینو صوانی کی دو کان پر آدھ سیرد ہی کی لسی پی کر ایک بڑی ڈکاری اور منجھوں کو منہ میں دبا کر ان کو چوستے ہوئے ایسے ہی بلند آواز میں کہا ہے  
بیری الی کی متی ”

یہ اُستاد منگو ہیں نیاقا نون، میں۔ اسی افسانے میں اہنی کی دول قوپری اور ماحظہ

ہوں:-

” چھاؤنی ہنپ کر منگو نے سواری کو اس کی منزل مقصود پر آتا رہا  
اور جیب سے سگریٹ نکال کر باہمیں ہاتھ کی آخری روائیکوں میں  
باکر سلاگایا اور اگلی نشست کے گھسے پر بیٹھ گیا ”

گھوڑے کی بائیں کھینچ کر اس نے تانگہ ٹھہرا یا اور پھٹلی  
نشست پر بیٹھ ہوئے گورے سے پوچھا:-

” صاحب پہاڑ کا ہماں جانا نامگہ ہے ؟ ”

اس سوال میں جاماعت نزیرہ انداز تھا۔ صاحب پہاڑ در ہستے  
وقت اس کا اور پھر کامونجھوں بھرا ہونٹ پنسے کی طرف کھینچ گی  
اور پاس ہی گال کے اس طرف جو مدھم سی لیکرناک کے نخنے سے  
ٹھوڑی کے بالائی حصے تک چل آرہی تھی، ایک لرزش کے ساتھ  
گبری ہرگئی ”

اہنی چھوٹی چھوٹی جزئیات سے ہمیں استاد منگو کو پوری طرح پہچاننے اور اس کی شخصیت کی گہرائیوں میں جذب ہونے کا موقع ملا ہے۔ ”پھاٹا“ میں گوپال کے پتا جی کا ذکر ایک جگہ اس طرح آیا ہے:-

”اس کو اپنے پتا جی کی ڈانٹا اچھی طرح بادھتی۔ اس کے پتا جی لالہ سر شو قم و اس تھانے دار نگوٹ باندھے نل کی دھار کے نیچے اپنی گنجی چندیار کئے اور رڑی تو ندی پر حائے موکھوں میں سے آم کارس چُوس رہے تھے۔“

”پھاٹا“ میں کچھ شب زندہ داروں نے جن کردوں کا جائزہ لیا تھا ان میں سے ایک کی لقصوں میں بنا لی ہے:-

”و کو نے میں ایک بہت بڑا پنگ تھا۔ جس کے پائے رنگیں تھیں۔ اس پر میل چادر بھپی ہوئی تھی، تکہہ جی بڑا تھا جس پر سُرخ رنگ کے چھوٹ کڑھے ہوئے تھے۔ پنگ کے ساتھ والی دیوار کے کارنس پر تیل کی ایک میل بوتل اور لکڑی کی کنگھی رڑی تھی۔ اس کے دانتوں میں سرکا میل اور کئی بال چھٹے ہوئے تھے۔ پنگ کے نیچے ایک ٹوٹا ہوا ٹرنک تھا جس پر ایک کالی گرگابی لکھی تھی۔“

”کپڑے اس کے خستہ مالت میں تھے لیکن میلے تھیں تھے کوٹ

کی آسینوں کے آہری سنتے کثرتِ استعمال سے گھس گئے تھے اور جو ٹھرے  
نکل آئے تھے، کالر کھلا تھا اور قیض میں ایک اور دھلانی کی مار محتی:

(باہنخ)

”بادرپی خانہ میں گرم معا令 کرنے والے وقت جب لوہے سے نو ماٹکرا  
اور دھکوں سے چھت میں ایک گوبنخ سی روز جاتی تو مومن کے نیلے  
پیرول کو بدرزش بہت بھلی معلوم ہوتی:“

(ربلا دُر)

”دہ ساگوان کے لبے اور چوڑے پنگ پر اوندھے منہ لیٹھی تھی  
اس کل باہیں جو کاندھوں تک ننگی تھیں۔ پنگ کی کانپ کی  
طریقی ہوئی تھیں، جو اوس میں بھیگ جانے کے باعث پتلے  
کاغذ سے جدا ہو جائے۔ دائمی بازو کی بغل میں شکن آؤ د گوشت  
آجھرا ہوا تھا۔ جو بار بار موڑھنے کے باعث نیل رنگت اختیار کر گیا  
تھا، جیسے بچی ہوئی مرغی کی کھال کا ایک ٹکڑا دہاں رکھ دیا گیا ہے۔  
(ہنگ)

یہ منٹو کی جزئیات لگاری کی صرف چند مثالیں ہیں اور جن کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ منٹو  
نے کسی واقع کی مصوری کرنے کسی ماحول یا افنا کا مجموعی تاثر قائم کرنے یا کسی کردار کی ظاہری  
ہیئت اور باطنی کیفیات بنانے کے لیے جو باتیں بیان کی ہیں۔ ان میں کبھی چھوٹی چیز اور  
چھوٹی بات کو تھوٹا سمجھ کر نظر انداز نہیں کیا۔

منٹو و نکار تھا اور فنکار کے نزدیک کوئی بات اور کوئی چیز معمولی اور حیرت نہیں ہوتی۔ دوسروں کو حیرت اور معمولی نظر آنے والی چیزیں غیر معمولی تاثرات اور نتائج کی حامل بن سکتی ہیں۔ بہتر طریقہ فنکار انہیں صحیح انداز سے اور محل برتنے پر قادر ہوا اور یہ قدرت منٹو میں بدرجہ اُتم موجود ہے۔

چھوٹی سے چھوٹی جزئیات انہیں عزیز بھی ہیں اور ان کی نظر وں میں محترم بھی۔ جزئیات کی قدر پہچاننے، انہیں عزیز رکھنے اور محترم سمجھنے نے منٹو کے فن کو اکثر زگاہوں میں پسندیدہ بنایا ہے۔

منٹو کے فن کے مختلف پہلو، جن میں افناہ کی ساخت، تشکیل اور اس کے اجزاء کے علاوہ اسلوب نگارش کی ساری خصوصیتیں شامل ہیں۔ یعنی تشبیہ، استعارے، کناٹیے، الفاظ اور فقردوں کی تکرار اور ان کے استعمال میں تقاد کا صرف اس کی شخصیت، مزانع اور انداز نظر سے متاثر ہوتے ہیں۔

منٹو کے سوچنے کا ایک خاص انداز ہے۔ وہ زندگی اور اس کے مسائل کو مختلف اوقات میں مختلف زادویوں سے دیکھتا ہے اور جو کچھ دیکھتا ہے اور سوچتا ہے اسے بغیر جھجک، نون اور اندریشے کے جرأت کے ساتھ بیان کر دیتا ہے۔ ان سب بالوں میں اس کے جدت پسند مزانع اور تووانا شخصیت کو بڑا دخل ہے۔

منٹو کی نظر میں گیرائی بھی ہے اور گہرائی بھی۔ سیاست، معاشرت، دین، اخلاق، معاشرہ اور فردان سب پاس کی گہری نظر ہے۔ اس کی باریک بین اور نقطہ رکس نگاہ ہر ایک کے حسن و قبیح، اچھائی براوی اور عیب و نہر کو اس طرح دیکھتی ہے کہ جسمی و انفرادی زندگی

کی کوئی حقیقت اس سے پوشیدہ نہیں رہتی۔ اس طرح عیب و ہنر پوری طرح احاطہ کر لیتے  
کے بعد وہ ان میں سے ہر ایک کا اس نظر سے تجزیہ کرتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ "ان ان  
نے انسان کے ساتھ سخت ناالتفافی کی ہے اور ایک ایسے انداز سے کی ہے کہ ناالتفافی کا  
شکار ہونے والے خود نہیں جانتے کہ ان کے ساتھ کون ناالتفافی  
کر رہا ہے اور کس کس طرح کر رہا ہے۔

منٹو نے اس ناالتفافی کو مٹانے اس کا پر دہ فاش کرنے اور اس کا تسلیم توڑنے کو  
اپنے فن کا مقصد بنایا ہے۔

زندگی کے اس بہت بڑے اور بے حدِ تم کام کا بڑیہ اُنچ نا بجا نے خود ایک مہم ہے لیکن اس  
سے سخت تر مہم یہ ہے کہ اسے کوئی عملی شکل دی جائے۔

منٹو کی مخصوص نظر نے انہیں جو کچھ دکھایا اور اس مشاہدہ کے بعد ان کے احساس درد نے  
انہیں جس کام کی طرف مائل کیا اس کے راستے میں بڑی رکاوٹیں ہیں۔ ہر ناالتفافی کرنے  
 والا سیاست، معیشت، دین اور اخلاق کے اداروں میں اجارتہ داری کی لذتوں کے راز  
جاننے والا ایسے لوگوں کا سب سے بڑا دشمن ہے جو اس کے رُخ سے فریب اور تسلیم  
کے پردے اٹھا کر اس کی حقیقت کے گھناؤنے پن کو رُسو اکرتا ہے اس لئے اس اجم کام  
کا بڑا اٹھانے والے کو اتنا نڈر، اتنا بے خوف اور جری ہونا چاہیے کہ وہ بردشمن کے  
 مقابلے کے لیے یعنی سپر بسے۔

منٹو کو فطرت کی طرف سے یہ بے خوفی، یہ حراثت اور یہ مردانگی عطا ہوئی تھی۔ اس کا  
اعصار میں اتنی قوت تھی کہ وہ بردوار کو دلیری سے رد کے اور اس کی ضرب کو بے نیاز کا  
ادر شکن طبعی سے حبیل لے۔

## منٹو کا فن

منٹو کے فن پر ان کی اس بے خوفی نے بڑا گہرا اثر ڈالا ہے۔ اچھا بھی اور بُرا بھی۔ اچھا اس طرح کے زندگی کی خرابیوں کا تجزیہ کر کے انہیں بے نقاب کر کے اور اس پر اکثر اوقات ایسی کاری ضرب لگا کے چوتھا کھانے والا نملاء کر رہ جائے، انسان اور زندگی کی بڑی خدمت کی ہے اور بڑا اس طرح کہ حیاتِ انسانی کے بعض مسٹور پیو دُں اور پوشیدہ رازوں کو اپنی دزدیدہ نگاہی سے یوں بے نقاب کیا ہے کہ جھیٹے ہوئے ماسروں کی غافلش کے سوا کوئی نتیجہ نہیں نکلا اور کبھی کبھی حقیقت بینی اور حقیقت نگاری سے دُنیا والوں کو صرف عربیانی سکھائی ہے۔ یوں اس بُرے پیلو کا ایک اچھا پیلو یہا ہے اور اس کی تاویل یہی کہہ کر کی جاسکتی ہے کہ یہ سب کچھ منٹو کا مزانعہ تھا۔ اس کی شخصیت تھی اور منٹو فریب کھانے کی طرح فریب دینے کو بھی گناہ سمجھتا ہے۔ اس نے اپنے فن پر اپنے آپ کو پوری طرح بے نقاب کیا ہے۔

منٹو کے مزانع کی یہ سب خصوصیتیں جنہوں نے ان کی شخصیت اور فنِ دلوں میں امیاز اور الفرادیت کے پیلو نمایاں کئے ہیں۔ سیاسی محل، معاشرتی انتشار، معاشی کشمکش اور بعض صورتوں میں ذاتی اور سُچی حالات سے متاثر ہوتی رہی ہیں۔

منٹو نے اپنی زبردست قوتِ ارادی سے ہر طرح کے انتشار و کشمکش اور رکاوٹیں پیدا کرنے والے حالات کا مقابلہ بڑی دلیری اور جواہری سے کیا۔ دیکھنے والوں نے دیکھا ہے کہ اکثر منٹو نے ان سب قوتوں کو مغلوب کر کے اپنے لئے فتح کی راہ نکالی۔ اور اپنے فن کو زندہ رکھا ہے۔ لیکن دیکھنے والوں نے بُرے دردِ غم کے سامنے حالات کے طوفان، انتشار اور کشمکشوں کی ٹکڑا دُڑ اور ریلے سے اس کے پیروں کو ڈگکھانے بھی دیکھا ہے۔ زندگی کے دنیوار گزار سفر کے بعض سخت مرعلوں پر اور بعض منزوں میں

اس نے اپنے آپ کو بے دست و پامحکوس کیا اور اپنے آپ کو عارضی شکست قبول کر لینے پر آہدہ پایا ہے۔ شکست کے اس احساس نے ان کےاعصاب پر را اثر ڈالا اور جب اس نے اعصاب کی وقت برقرار رکھنے کے لیے کسی آپ زندگی کو اپنا سہارا بنایا تو اس کے اعصاب پہلے سے بھی زیادہ بے بس اور مجبور ہو گئے۔ یوں کبھی کبھی اعصاب کی اس سخت کشکش اور خارجی ماحول اور سروں زندگی کے اس تقادم میں کبھی کبھی اس کی شخصیت کی توانائی ہر چیز پر غالب بھی آتی ہے۔ اور منٹو کی شخصیت کی غلطیت اور عیاں ہونی ہے۔ لیکن یہ عارضی فتح عموماً اعصاب کو اور زیادہ مغلوب اور پیارا بنانے کا پیش خیمه بنی ہے۔ منٹو کی زندگی میں ماحول اور اعصاب کی یہ جنگ یوں تو اس کی حیات فن کے ہر دور میں جو کچھ لکھا ہے اس میں اس شکست و فتح کے تواتر کی جھلکے عیاں ہے کہ منٹو نے ماحول کچھ نہیں لکھا۔

کبھی ایسا ہوا ہے کہ اس نے کئی کئی دن تک مسلسل بروز ایک افسانہ لکھا ہے اور اس طرح تواریخ اور تسلیم سے لکھے ہوئے افزاں میں بھی کسی ایک سلسلہ میں وہ کوئی اچھا افسانہ نہیں لکھ سکا اور کبھی ہر روز ایک اچھا افسانہ لکھا۔ مثلاً منٹو کے مجموعے "ٹھنڈا گوشت" کے سب افسانے (سوائے ٹھنڈا گوشت کے) ۱۹۵۳ء اور ۱۹۵۴ء کے درمیان لکھے گئے۔

"بادشاہت کا خاتر" (مجموعہ) کے سب افسانے یہ کم جوں سنہ ۱۹۵۴ء اور چودھویں جون سنہ ۱۹۵۵ء کے درمیان لکھے گئے۔ اسی طرح "بزریہ" (مجموعہ) کے سب افسانے چاراکتوں اور پندرہ نومبر سنہ ۱۹۵۵ء کے درمیان لکھے گئے۔

منٹو کے آخری دور کے بعض مجموعے جو ذیر ترتیب اور زیر انتاعت نہیں۔ منٹو

کی اس ذہنی کیفیت کی ترجیحی کرتے ہیں۔ اور ان انسانوں کو بڑھ کر پڑھنے والا نمایاں طور پر تین باتیں محکوم کرتا ہے۔ ایک بات تو یہ ہے کہ اس دور کے لئے ہوئے انسانوں میں سے اکثر مجموعی حیثیت سے منٹو کے کم تر درجے کے افسانے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس دور میں بھی جب بظاہر منٹو کا فن اختلاط کی منزوں سے گذر رہا ہے چند اچھے اور بہت اچھے افسانے بھی لکھے ہیں۔ اور تیسرا یہ کہ ان انسانوں میں بھی جنہیں ہم مجموعی حیثیت سے ان کے اچھے افسانے نہیں کہہ سکتے جا سجا منٹو کی ذہانت ان کی جدت پسندی، ان کی شوخی طبع، ان کی گھری طنز اور فن کے ساتھ ان کی فطری سابقہ جلوہ گرنے نظر آتی ہے۔

منٹو کی قادر الکلامی اور اس سے بھی بڑھ کر ان کے فن کی یہ خصوصیت کہ وہ کہانی کہنا جانتے ہیں اس دور میں بھی اسی تازگی اور قوانین کے ساتھ نمایاں ہے۔

منٹو کے ہر دور کے افسانے۔ بہت اچھے اور بُرے سب افسانے دیکھ کر پڑھنے والا ان کی جس خصوصیت سے سب سے زیادہ تاثر ہوتا ہے یہی ہے کہ ان انسانوں میں کہانی کی لذت ہے۔

منٹو کو فطرت نے ایک فقہہ گو بن کر بھیجا تھا۔ اس نے جب افسانہ لگاری شروع کی جب بھی اس میں فطرت کی دی ہوئی اس صلاحیت کو برتنے کی پوری قوت تھی اور جب اس نے مجبوراً دربے بس ہو کر مرنے سے چند دن پہلے تک افسانے لکھنے تو اس کی یہ صلاحیت اس میں اپنے پورے محسن کے ساتھ موجود تھی۔

منٹو کو ایک فقہہ گو کی حیثیت سے کہی گئی کی معلوم تھیں اور فقہہ گو کے ساتھ اس کے فطری میدان اور فن کے ساتھ اس کے بے پایاں لگاؤ نے اس میں ان گر کی باتوں

سے پوری طرح فائدہ اٹھانے کی عادت پیدا کر دی تھی۔

منٹو کو علم تھا کہ زندگی میں ہر قدم پر ایک کہانی ہے ہر لسان اور ہر دل پر منوع ہے۔ لیکن اس ہی کم حیثیت اور کیسا ہی مہولی کیوں نہ ہو کہانی کا ٹراموزول اور دلپ پر منوع ہے۔ کیونکہ کے لئے ایک شرط ہے اور بغایہ بہت مہولی ہونے کے باوجود یہ شرط قدر گوئی کے لئے بڑی اچھی ہے اور وہ شرط یہ ہے کہ کہانی کہنے والا ایک ایسا انداز اختیار کرنا جانتا ہے کہ کہانی شروع ہوتے ہی اس میں اور کہانی سننے یا پڑھنے والے میں انتہائی یگانگت اور بے تکلف کا رشتہ قائم سو جائے۔

پڑھنے یا سننے والایہ محوس کر سکے کہ قدر گواہے اپنا ہمارا سمجھ کر اسے اپنے دل کی بڑی سے بڑی بات بتانے میں بھی تالی نہیں کرسے گا۔ وہ اپنی خوشی اور غم میں اسے پوری طرح شریک کرے گا۔

کہانی سننے والے کے دل میں اپنی طرف سے یہ اعتماد پیدا کرنا اور ایک جان دو قلب ہو کر اس سے مہولی سے مہولی بات بھی اس طرح کہنا کہ جیسے وہ بلے عدایم ہے، کہانی کہنے والے کی بڑی حیثیت ہے۔

منٹو قدر گوئی کے میدان میں یہ جیت حاصل کرنے میں ماہر تھا۔ وہ بڑی سے بڑی اور بچھوٹی سے بچھوٹی بات اس طرح باتیں کرنے کے انداز میں دوسروں سے کہہ سکتا تھا۔ کہ دوسراے اس کے عجوب کو، اس کے پُر فریب تخلیل کو، اس ذہانت کی آغوش میں پلے ہوئے عجیب و غریب نعمور کو پچ سمجھو کر قبول کرتے اور اس سے لطف لیتے تھے۔ مہولی سی بے حقیقت بات کسی طرح کہانی بن سکتی ہے اس کی شال منٹو کا افسانہ "چوہے دان" ہے۔ کہانی میں کس طرح باؤں کامزا پیدا کر کے اپنے پڑھنے والے کے احساسات میں مکمل مطابقت

پیدا کی جاسکتی ہے۔

اس کا اندازہ 'چند'، 'مسٹین والا'، 'میرا نام را دتا ہے'، 'ٹولو، ننگی آوازیں، حادث کا بچھہ، رحمت خداوندی کے پھول، خورشید، باسط، ٹیوان کا کتا، چور، نکل، اور والدہ'۔ کے افساؤں کو پڑھ کر ہو سکتا ہے اور کسی طرح عجیب و عزیب اور ناقابلِ افہار خیال افساؤں میں جگہ پا کر اور منٹو کی پاکیتی کے حلقة بگوش بن کر پڑھنے والوں کا دل مود سکتے ہیں۔ یہ 'پرن' صاحب کرامات، بادشاہیت کا خاتمہ، کتنے کی دُعا اور 'علت' کے لیے، جیسے افسانے پڑھ کر کوس کیا جاسکتا ہے۔

منٹو اپنے قریبی ماحول میں سے اتنی آسانی سے کوئی کہانی پیدا کر لیتا تھا کہ دیکھنے والے کو یہ رستہ ہوتی تھی۔ وہ گپ کو کس طرح سنبھیڈ، مقاصد کے لیے استعمال کر سکتا تھا۔ یہ بات اور بھی زیادہ یہ رستہ کی تھی۔ لیکن یہ سب کچھ اس نئے تھا کہ منٹو کہانی جانتا تھا اور اپنی اور بہت سی فنی کمزوریوں کے باوجود داپنے آخری دراً سخطاط میں بھی وہ کہانی کہنا بخوبی لایا۔ اسی لئے اس اسخطاط کے زمانے میں منٹو کے افرانے مثوق سے پڑھے جاتے تھے۔

بھی ساری باتیں ہیں جو مل جمل کر منٹو کے نن میں زندگی بھی پیدا کرتی ہیں اور الفرادیت در عینقت بھی۔ لیکن منٹو میں اگر اسکنڈل کو افساؤں کا موضوع بنانے کی کمزوری نہ ہوتی پڑھنے والوں میں کبھی کبھی ایک ہنگامہ اور گرما گرمی پیدا کر دینے کے لیے وہ اگر چونکا دینے والی باتیں کہنے اور لکھنے پر اصرار نہ کرتا وہ اگر اپنی طنز کو اصلاح کے بلند مقاصد کے لیے استعمال کرنے کے سجائے کبھی کبھی اسے زبر میں بچھے ہوئے میردوں کی طرح برتنے اور دسر دل کو کچھ کے دے کر اس میں لذت محسوس کرنے کی عادت ترک کر سکتا اور جنسی سنجنی

کولنیات کی ناذک حدود میں رکھنے کے بجائے اسے کوچہ و بازار میں رسوائی کرنے سے پرہیز  
کر سکت تو منٹو یقیناً اس سے محی بردا فنکار ہوتا۔ جیسا کہ وہ اب تھا۔

اس لئے کہ اس سے انکار کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں کہ وہ ان چند کمزوریوں کے باوجود  
بہت بڑا فن کا رہتا اس کے مثابدہ، تخلیل، تصور، فکر اور حاس میں اس کی شخصیت کا گمرا  
زنگ ہے اور شخصیت میں عین معمولی قوت و توانائی، وہی قوت و توانائی اس کے پورے  
فن پر پہچائی ہوئی ہے۔ اور آئے دالے ہر دوسریں ہر طرح کے حادث کے خلاف سپرن کر  
اس کی حفاظت کرے گی اور اسے زندہ رکھے گے۔ ————— منٹو مرگی ————— لیکن  
اس کا فن اسے مرنے نہیں دے گا۔

---

# مطبوعات اعجاز پبلشنگ ہاؤس

اردو میں مشکل الفاظ کی فرنگ  
وڈاؤ آفٹ سے طبع شدہ  
**فیروز للغات** اور دو جلد  
طلیار اور معنوں میں حصہ لینے والوں  
کیلئے ایسیں ستر ہزار سے زیادہ  
الفاظ کے معنی ہیں۔ کام الفاظ  
پر اعراب تاک صحوح تلفظ کیا جاسکے  
ہر احمد کی تذکیرہ تائیت بھی ہے۔  
ایسیں تمام متداول اور مشکل الفاظ  
میں جو درسی اور ادبی کتب اور  
اخبارات درسائل ہیں ہم تھجھاں ہوتے  
میں قیمت مجلد و مگزین ۲۵/-

**باغ و بہار (صور)**  
میر اتنی مقدمہ سلیم اختر  
قیمت مجلد ۱۵/-  
طلباً یڈیشن ۱۲/-  
نوٹو آفٹ کی پر کشش طباعت

**بُشِّرَةُ النَّبِيِّ**  
بُشِّرَةُ بَعْدِ رَأْيِ النَّبِيِّ

یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس  
کو لظر انداز نہیں کیا جاسکتا جیسا  
طیبہ کے دوران جو جو افعال د  
اعمال آنحضرت صلعم کی ذات با  
برکت سے سرانجام پلتے تھے میرزا  
۱۹۰۰ سو سال سے قریب قریب آج  
بھی اسی انداز میں پائیں گیل کو پنج درسی  
ان رو بانعالہ کو تحقیقی نظر سے دیکھئے۔

**مثنوی زہرِ عشق**  
جدید تحقیق کی روشنی میں  
مرتبہ عشرت رحمانی  
نوٹو آفٹ طباعت  
قیمت ۱۵/-

**اقبال کی گہانی**  
پچھے میری کھاؤں کی گہانی  
رادی ٹوا کر رکھیر الدین ابجانی  
قیمت ۱۰/-

نوٹو آفٹ کی پر کشش طباعت

**تنقیدی دلستان**  
سلیم اختر  
نوٹو آفٹ طباعت  
قیمت ۲۰/-

**تحقیقی تنقیدی مطالو**  
باغ و بہار  
مرتبہ سلیم اختر قیمت ۱۲/-

**ولی**  
انتخاب و تہذیب  
محمد خان اشرف

نوٹو آفٹ قیمت ۹/-

**جیل**  
(برائے طلب ایڈیشن)  
خشی بر کم چند قیمت ۰۴/-

**مقدمہ آپ حیات**  
مولانا محمد حسین آزاد  
قیمت ۶/۵.

**آہیتا کا تنقیدی و تحقیقی مطال**  
مرتبہ: سید سجاد  
قیمت ۶/-

**باغ و بہار تحقیق و تنقید کے**  
آئیسے میں  
مرتبہ سلیم اختر قیمت ۰۴/۵.

**تنقید و تبصرہ امراء جان ادا**  
ڈاکٹر ابواللیث صدیقی  
قیمت ۳/-